رنگ کا پتّہ

امرتا پریتم

رنگ کا پتہ

امرتا پریتم کی دیگر کتب

۱۔ محبت نامے

۲۔ رسیدی ٹکٹ

۳۔ میرا کمرہ

۴۔ یہ سچ ہے

۵۔ انچاس دن

۶۔ ڈاکٹر دیو

۷۔ پانچ برس لمبی سڑک

۸۔ ایک تھی انیتا

۹۔ ایک لڑکی ایک جام

۱۰۔ ایک المیہ

۱۱۔ دلّی کی گلیاں

۱۲۔ میں جمع تُوں } شاعری

۱۳۔ نویں رُت } شاعری

۱۴۔ ایک ہاتھ مہندی ایک ہاتھ آبلہ

۱۵۔ شوقِ صراحی

۱۶۔ نئی قلمیں

۱۷۔ پنجرہ

۱۸۔ ناگ منی

رنگ کا پتّہ

امرتا پریتم

مکتبہ اُردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ——— سرفراز احمد
مطبع ——— زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
قیمت ——— ۱۵/- روپے

"اری کیلی یہ کیا کر رہی ہے؟" مترو لپک کر بھرے ہوئے گھڑے پر ہاتھ ڈالنے ہی لگی تھی کہ عین اس وقت اُس نے پرے کھال پر بیٹھی ہوئی کیلی کو دیکھا۔ گھڑا اُس نے کنوئیں کی منڈیر پر ہی رہنے دیا اور وہ دبے پاؤں کیلی کی پیٹھ کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ مترو کا جی چاہا تھا کہ وہ پیچھے کی طرف سے آکر کیلی کی آنکھیں بند کر لے گی۔ اور کیلی جب تک "مترو——شترو——!" کہہ کہہ کر ہانپ نہیں جائے گی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں کہے گی لیکن جس وقت مترو نے کیلی کے چہرے پر آنسوؤں کی دھاریں دیکھیں تو اُس کے منہ سے نکلا۔

"اری کیلی یہ کیا کر رہی ہے؟"

کیلی نے اُسی طرح بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ مترو کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے کہا "روٹی پر سے چیونٹیاں اُتار رہی ہوں۔"

مترو نے اپنے دوپٹے کے کنارے سے کیلی کا منہ پونچھا اور ہنستے ہوئے کہنے لگی "کبھی تو سیدھی بات کیا کر۔ جب دو گی اُلٹا ہی جواب دو گی۔"

کیلی خاموش رہی۔ پھر مترو نے خود ہی قیاس لگایا اور پوچھا "کیا لکھے شاہ والی بات بن گئی——"

کیلی نے خشم آلود نگاہوں سے مترو کی طرف دیکھا اور کہا "اری بیرن بن گئی ہے ـــــ بن گئی ہے ـــــ تو نے اپنی کالی زبان سے یہی تو مانگا تھا" چل ہٹ کلموہی۔ ساری عمر راج کرنا اور میری کالی زبان کو دعا دینا ـــــ"

"دعا دوں گی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی میرے منہ سے کچھ نکل چلا تھا۔"

"منہ سے جو کچھ نکلتا ہے نکال لو ـــــ دل کی بھڑاس دل میں کیوں رکھتی ہو ـــــ"

"میں کیا کہوں گی"، کیلی نے سرد آہ بھری اور کہا "ماں کہتی ہے کہ بیٹیاں منہ سے کچھ نہیں کہا کرتیں۔ اُن کی زبان تو پیدا ہوتے ہی کٹ جاتی ہے۔"

"اری رہنے دے ـــــ یہ باتیں ـــــ تو کٹی ہوئی اس زبان سے ایک چیز مانگے گی تو بتیس حاضر ہو جائیں گی۔"

"نہ جانے تیرا دل کس چیز کا بنا ہوا ہے مترو ـــــ لوہے کا یا پتھر کا ـــــ؟"

"سونے کا"

"تو سچ کہتی ہے مترو۔ تیرا دل سونے کا بنا ہوا ہے"، کیلی نے ٹکٹکی باندھ کر مترو کے منہ کی طرف دیکھا جیسے وہ اپنی نگاہ کی کسوٹی پر سونا پرکھ رہی ہو۔ پھر وہ ایک آہ بھر کر کہنے لگی "جبھی تو سونا بیچنے پر تُل گئی ہے۔ ایسے دل کو بیچ دے ۔ وہ چالیسویں چک والا بنیا اچھے دام دے گا۔"

"اری کیلی میں تیرے ان طعنوں کو سمجھتی ہوں"، مترو نے گھاس کا ایک تنکا اٹھا کر دانتوں میں توڑا اور پھر اسے تھوکتے ہوئے بولی "اگر تجھے اس رانگڑ سے اتنا ہی پیار ہے تو اس کا گھر کیوں نہیں آباد کر دیتی؟"

"میں تجھ ایسی بھیلنی کے جھوٹے بیر تو کھانے سے رہی کلموہی۔ یہ بات کہتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی؟"

"اری کیلی۔ جس گھر میں دانے اُس کے پگلے بھی سیانے۔ کل تو مکھتے شاہ کی شاہنی (سیٹھانی) بن جائے گی تو پھر ہمیں تو بے شرم ہی کہا کرے گی تو عزت والی آبرو والی۔"

"تجھ پر ہزار لعنت۔"

"تیری تو یہ خواہش ہے کہ میں اُس رام گڑھئے (بڑھئی) کے گھر جا کر زندگی بھر بُرادہ جلاتی رہوں۔"

"نہیں۔ نہیں تجھ سے یہ بُرادہ نہیں جلایا جائے گا۔ تو کٹور سے میں گوند گھولنا اور پھر اُس گوند سے اُس بنیے کے پیسے جوڑنا۔"

"اب تجھے بہت باتیں بنانی آگئی ہیں۔ تجھے جُڑی ہوئی رقم جو مل گئی ہے۔"

"اگر تیرے دل میں اتنی ہی حسرت ہے تو میری جگہ تو مکھتے شاہ کے ساتھ پھیرے لے لے۔"

"بس رہنے بھی دے۔ ہاتھ آیا سنگھاسن کون چھوڑتا ہے۔"

"یہ بات ہے تو آزما کر دیکھ لے مترو۔ تو میرا مری کا منہ دیکھے اگر۔۔۔"

مترو نے جلدی سے کیلی کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور بولی "میں تیرا اجلتی کا منہ ہی دیکھوں گی۔ شاہنی بنی کا منہ۔ اچھا یہ تو بتا۔ کیا موسی نے تجھے اس کو ایک نظر دیکھنے کا موقع دیا ہے یا نہیں۔؟"

"ہاں دیکھ آئی ہوں اور منہ دیکھ کر سرشار ہو چکی ہوں۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری رانی کو پسند نہیں آیا۔"

"اچھا بھلا تھا میری روٹی جیسا۔ حجامت نہ جانے کون سے نائی سے بنوا کر آیا تھا۔ چھوٹے اور موٹے بال یوں معلوم ہوتے تھے۔ جیسے روٹی پر چیونٹیاں چڑھی ہوئی ہوں۔"

"اچھا۔ جبھی تو رو رہی تھی اور یہ کہہ رہی تھی کہ روٹی پر سے چیونٹیاں اُتار رہی ہوں۔ پیاری۔ چُپڑی اور دو دو۔ چیونٹیاں جھاڑ کر روٹی تو مل جائے گی۔ مگر اُس پھول جیسے چہرے کا کوئی کیا کرے گا۔ جس کے گھر میں روٹی بھی نہ ہو۔"

"سچ مترو۔ میری اماں کے یہاں تو تجھے جنم لینا چاہیئے تھا۔ میں تو یونہی غلطی سے جنم لے بیٹھی ہوں۔"

"موسی بھی تو یہی کہتی تھی نا؟"

"ہاں۔ یہی کہتی تھی۔ جو تو کہہ رہی ہے۔ کہتی تھی کہ مرد کا منہ نہیں دیکھا کرتے مرد کی جیب دیکھا کرتے ہیں۔"

"میری موسی نے ایک دنیا دیکھی ہے۔"

"مگر تیری موسی نے دل نہیں دیکھا۔"

"اگر تو دلوں کو اتنا ہی پہچانتی ہے تو پھر منہ پھاڑ کر انکار کر دے۔"

"کس بوتے پر انکار کر دوں۔ اگر تیری طرح میرا بھی کوئی عاشق ہوتا تو میں منہ پھاڑ کر انکار کر دیتی۔ چاہے میرے منہ کے ساتھ ساتھ میرا سینہ بھی پھٹ جاتا۔"

"اگر تو اس بات پہ اُتر آئی ہے تو ڈھونڈھ لے نا کوئی عاشق۔"

"عاشق تو خدا کا دیدار ہوتا ہے۔ نہ نصیب ہو تو بارہ برس تک ریاضت کرنے پر بھی نصیب نہ ہو۔" کیلی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

متر و نے اپنی آنکھیں جُھکا لیں اور پھر آہستہ آہستہ ایک تنکے کو دانتوں تلے کاٹتے ہوئے بولی "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں تو اور "بخشا" ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہو۔"

"شکر ہے کہ آج تو نے اُس کا نام لے کر بات کی ہے ورنہ ناس پیٹی ہمیشہ اُسے "مانگرڈ" کہا کرتی ہے اچھا تو کیا کہہ رہی تھی کہ میں اور بخشا ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ . . . "

"ہاں یہی کہ تم دونوں کو انسانوں میں خدا نظر آتا ہے۔"

"مجھے تو ابھی تک کسی میں دکھائی نہیں دیا۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ اگر خدا کہیں نظر آسکتا ہے تو اُس چہرے میں نظر آسکتا ہے جسے انسان پیار کرتا ہے۔" کیلی نے ایک مسرت انگیز کیفیت سے ہم کنار ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر چونک کر متر و کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی، "تو نے بہت اچھے کرم کئے ہیں متر و کہ تیرے چہرے میں کسی کو خدا نظر آتا ہے۔

"اُسے دکھائی دیتا ہے مگر مجھے تو دکھائی نہیں دیتا،" متر و ہنسنے لگی۔ کیلی متر و کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس ہنسی سے متر و کا منہ ٹیڑھا ہو گیا ہو۔ اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"نکمی کہیں کی۔ تیری آنکھیں ہیں کہ جھاڑیوں سے لگے ہوئے ڈھیلے کہ تجھے اس میں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔؟"

"اری کیلی۔ نہ اُس کا گھر نہ اُس کا دروازہ۔ وہ خود اپنے چچا کے یہاں روٹیاں توڑتا ہے۔ کل مجھے کہاں سے کھلائے گا۔؟"

"بدنصیب۔ تو اُس کی تجوریاں دیکھ رہی ہے۔ مگر اُس کے ہاتھوں کا ہنر نہیں دیکھ رہی۔"

"وہ ہُنر بھی کیا ہے کیلی —— ایک آری سے لکڑیاں چیر کر وہ کون سا محل بنالے گا۔ ساری عمر تین روپے روز ہی تو کمائے گا۔ ذات نہ برادری۔ میں کشتریوں کی بیٹی ہوں۔ وہ رام گڑھیوں کا بیٹا ہے۔ ماں باپ کے آگے شرمندہ ہوں گی۔ شرمندہ کیا ہوں گی — ساری عمر اُن کے منہ لگنے سے جاؤں گی اور —" متّرو خاموش ہو گئی۔

"اور ساری عمر بُرادہ جلاتی رہوں گی۔ کہہ دے جو کہنے لگی تھی" کیلی نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔

"تو مذاق تو کر رہی ہے کیلی مگر میں روٹی اپنے دل کا آٹا گوندھ کر تو نہیں پکا سکتی"

"تو بھلا دل کا آٹا کیوں گوندھنے لگی متّرو۔ دماغ کو چیر کر اُسی کا سالن تیار کرنا۔"

"اتنے طعنے نہ دے کیلی سڑیلی۔ مجھے بھی چھوت کی بیماری لگ جائے گی۔" اور پھر متّرو نے بڑے انکسار سے کہا "بخشا جب معصوم سا منہ بنا کر

باتیں کرتا ہے تو میرے دل میں خدا کی قسم ہلچل سی مچ جاتی ہے،،

" نہیں۔ نہیں۔ تیرے دل کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کیا گوشت اور لہو کا بنا ہوا ہے کہ اس میں ہلچل پیدا ہو۔ وہ تو سونے کا دل ہے اسے کوئی بیماری نہیں چھو سکتی۔ وہ جھوٹا بھی نہیں ہوتا۔ دھو دھا کر اسے بنیے کے حوالے کر دینا"

متّرو کی ہنسی چھوٹ گئی۔

" بھلا کیلی۔ تیری اور بخشے کی جوڑی کیسی رہے اگر میں بخشا تجھے سونپ دوں۔ تم دونوں مل کر ہوا میں ایک محل بنا لینا۔ رات کو سر کے نیچے چاند کا تکیہ رکھ لیا کرنا اور دن کو سورج کا۔ چاہنے والوں کو بھوک تو لگتی ہی نہیں "

" لعنت ہو تجھ پر۔ یہ بھی کیا کوئی مکان ہے کہ تو اُسے میرے ہاتھوں بیچ دے گی ــــ؟ پیار تو خدا کی درگاہ میں ملتا ہے اور وہ بھی زندگی کی بولی دے کر۔۔۔۔"

" تو پھر تو ملکے شاہ کے حصے میں کیسے آگئی۔؟ تجھے تو کسی دل شکستہ عاشق کے حصے میں آنا چاہیئے تھا،،

" یہ میری قسمت ہے متّرو ــــ میرے والدین کو اس جنم میں ملکھے شاہ کا کچھ نہیں دینا تھا شاید پچھلے جنم میں کچھ دینا ہو ــــ اُس نے سود در سود لگا کر میرے والدین کے کھونٹے سے گائے نہ کھولی بیٹی کھول لی ــــ" اور کیلی رو دی۔

بابل میرا صرف ایک کہنا مان لیجئے۔
مجھے "رام رتن" بر دیجئے۔
اے بیٹی بر ڈھونڈھ کر لے آیا ہوں۔
اُس کے رنگ میں گلاب کھلا ہوا ہے۔
اے بیٹی رام رتن کے سر سہرا یوں ہے۔
جیسے باغ میں کیوڑا کھلا ہو!

سہاگ گیتوں کے کان تو ہوتے ہیں مگر آنکھیں نہیں ہوتیں۔ جب کوئی سر پر سہرا باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے تو ان گیتوں کو وہ "رام رتن" ہی دکھائی دیتا ہے۔ ملکھے شاہ نے بھی جب کیلی سے شادی کرنے کے لئے سر پر سہرا باندھا تو سہاگ گیتوں نے اپنی عادت کے مطابق گانا شروع کر دیا۔
"اے بیٹی۔ رام رتن کے سر سہرا یوں ہے۔"
اور ملکھے شاہ نے لوک گیتوں سے اپنا نام رام رتن رکھوا کر کیلی سے شادی کر لی۔

کیلی اگرچہ لوک گیت کی زبان سے بلند آواز میں کہتی رہی تھی کہ بابل مجھے ایسے گھر میں دینا جہاں ساس کے سات بیٹے ہوں۔ بابل تیرا بھلا ہوگا۔ لیکن بابل عرف ڈُبنا کے کان شاید بہرے تھے۔ اُس نے یہ بات اُلٹی ہی سُنی کیلی جب سسرال گئی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی ساس کا صرف ایک بیٹا تھا۔ وہی لکھے شاہ؟ لیکن اُس کی سوت کے تین بچّے موجود تھے۔ کیلی سوچنے لگی اگر تین کی جگہ پورے سات ہی ہوتے تو کیا حرج تھا۔ کیلی کو دوسرے ہی دن ویسے پتہ چل گیا۔ اگر پہلوٹی کا بیٹا زندہ ہوتا اور منجھلی لڑکی چیچک نکلنے پہ مرنہ جاتی اور ست ماہے دو بچّے نہ چل بستے تو پورے سات ہی ہوتے۔

بیاہ کے سارے گیت یوں اُلٹے ہوگئے جیسے قسمت نے بھول کر دوشالے کی اُلٹی طرف سر پہ اوڑھ لی ہو اور تمام گانٹھیں اور ٹانکے اوپر کی طرف آگئے ہوں۔ کیلی کے منہ سے لقمہ لگاتے ہوئے لکھے شاہ کی اِدھر اُدھر کی ملنگے کی بہنوں نے جس دن یہ گیت گایا "بھابی ایک اور نندیں چار۔ باری باری لقمہ دے رہی ہیں" اور اس کے بعد تیسرے دن جب وہ کرتہ اور دوپٹہ لے کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں تو کیلی لکھے شاہ کے تینوں بچّوں کو مونڈھوں پر بٹھا کر باری باری لقمے دینے لگی۔ بڑا لڑکا اگرچہ آٹھ برس کا تھا اور خود ہی نوالے توڑ کر کھا سکتا تھا۔ لیکن جب سے کیلی آئی تھی وہ روٹھا ہوا بیٹھا تھا۔ گزشتہ تین روز سے اُس نے روٹی کی تھالی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے کیلی اُسے بازو سے پکڑ کر مونڈھے پر بٹھلانے اور نوالے توڑ کر اُس کے مُنہ میں ڈالنے لگی تھی۔ اُس سے چھوٹا لڑکا چھ برس کا تھا۔ جب وہ ڈیڑھ

برس کا تھا تو گھٹنوں کے بل چلتا چلتا منڈیر پر سے گر پڑا تھا اور ایک اینٹ کی نوک اُس کے سر میں لگی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ زندہ تو بچ رہا تھا اور اُس کی عمر اپنی راہ پر چل پڑی تھی۔ مگر اُس کی دماغی حالت جوں کی توں رہی تھی۔ بولتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی اور سنتے ہوئے اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ خود روٹی کھا لیتا تھا لیکن نہایت بے ڈھنگے پن سے۔ کرتے پر دال گرا لیتا تھا اور سارے منہ پر سالن لتھیڑ لیتا تھا اس لئے کیلی اُسے بازو سے پکڑ کر مونڈھے پر بٹھاتے اور نوالے توڑ کر اُس کے مُنہ میں ڈالنے لگی تھی۔

سب سے چھوٹی لڑکی چار برس کی تھی اُس کے دائیں ہاتھ پر کتنے ہی دنوں سے ایک پھوڑا نکلا ہوا تھا۔ شادی کی گہما گہمی میں اُس کے ہاتھ پر کئی بار چوٹ لگی تھی جس کے باعث پھوڑے کی ٹیسوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب اُس سے روٹی کا نوالہ توڑا نہیں جاتا تھا اس لئے کیلی اُسے پچکار کر مونڈھے پر بٹھانے اور نوالے توڑ کر اُس کے منہ میں ڈالنے لگی تھی۔

بڑے لڑکے کا نام سوہن تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ اس لئے سب اُس کو "کالا" کہہ کر بلاتے تھے۔ چھوٹے لڑکے کا نام ابھی تک کسی نے رکھا ہی نہیں تھا۔ جب سے وہ ہکلانے لگا تھا۔ سب اُسے "لولا" کہنے لگے تھے چھوٹی لڑکی کی آنکھوں میں سبز جھلک تھی۔ اس لئے شروع ہی سے سب نے اُس کا نام "بلّو" رکھ دیا تھا۔

کیلی جب کالے۔ لولے اور بلّو کو روٹی کھلا چکی تو وہ ایک کٹورے میں بیاہ کی بچی ہوئی مٹھائی لے آئی وہ بچوں کا منہ میٹھا کرانے لگی تھی کہ اتنے میں لکھے شاہ

نے جلدی سے کہا۔

"سنو ابھی یہ مٹھائی رہنے دو۔ یہ تو ابھی چار روز اور کاٹ جاتے گی۔ عقبی کمرے میں جاؤ۔ وہاں ایک ٹین اور پڑا ہوا ہے اُس میں میرے بھائی کی شادی کی بچی ہوئی مٹھائی پڑی ہوئی ہے۔ پہلے اُسے نبیڑ لو۔"

یہ ملکھے شاہ کا کون سا بھائی تھا۔؟ اُس کی شادی کب ہوئی تھی۔ کیلی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن جب کیلی نے عقبی کمرے میں مٹھائی کا ٹین ڈھونڈھا تو کنکروں کی طرح سوکھی ہوئی مٹھائی دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ ہو نہ ہو جب وہ یہ مٹھائی کٹورے میں لے کر جائے گی تو ملکھے شاہ اُس سے کہے گا "سنو یہ مٹھائی رہنے دو۔ یہ تو ابھی دو دن کاٹ جائے گی۔ عقبی کمرے میں جاکر دیکھو وہاں ایک ٹین اور پڑا ہے اُس میں میرے باپ کی شادی کی مٹھائی بچی ہوئی پڑی ہے۔ پہلے اُسے نبیڑ لو۔"

کیلی کی سہاگ سیج کے نیچے آٹھ اینٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ چاروں پایوں کے نیچے دو دو اینٹیں۔ چونکہ لوہے کا صندوق جس میں بہی کھاتے رکھے ہوئے تھے۔ جس میں لوگوں کے رہن رکھے ہوئے زیور پڑے تھے۔ اور جس میں آبا و اجداد کے وقت کے چھلّے اور بالیاں پڑی ہوئی تھیں۔ چارپائی کے نیچے پورا نہیں آتا تھا۔ اس لئے لکھے شاہ نے چاروں پایوں کے نیچے دو دو اینٹیں رکھ کر چارپائی کو اونچا کر لیا تھا۔

شاید چارپائی کی ادوائن ڈھیلی تھی۔ اُس پر بیٹھتے ہی کیلی کے بدن میں لوہے کے صندوق کی ایک نوک چبھی اور منزو کی ایک بات اُس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ "بھلا کیلی تیری اور بخشے کی جوڑی کیسی رہے اگر میں بخشا تجھے سونپ دوں۔ تم دونوں مل کر ہوا میں ایک محل بنا لینا اور رات کو سر کے نیچے چاند کا تکیہ رکھ لینا۔" اور کیلی دل ہی دل میں منزو کے منہ کی طرف تکتے ہوئے کہنے لگی "بخشا تو میرے بھائی کے برابر ہے منزو۔ میں اُس کی طرف تو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔ ہاں اگر خدا مجھے میرے برابر کا کوئی محبوب بخش دیتا تو میں واقعی سر کے نیچے چاند کا تکیہ رکھ کر سوتی

اے نصیب جلی۔ یہ دیکھے جب دلوں کو ان کے برابر کے محبوب نہیں نصیب ہوتے تو سر کے نیچے کیسے تکیے ہوتے ہیں؟"

رات بھر کیلی کو لکھے شاہ کے کرتے سے ایک عجیب سی بُو آتی رہی۔ اور پھر کرب و اضطراب سے بلبلاتے ہوئے نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی سورج نکل آیا تھا۔ جب کیسلی کے کندھے جھنجھوڑ کر اُس کی سوتیلی بیٹی نے جگایا۔

"پتاجی کو آج کچہری جانا ہے اور جلدی۔ وُہ لسّی مانگ رہے ہیں" اور کیلی نے جب تکیہ پر سے سر اُٹھا کر اپنے سر پہ دوپٹہ سنوارا تو اُسے اپنے دوپٹے میں سے ایک عجیب قسم کی بُو آئی۔ اُس نے چونک کر اپنا دوپٹہ اُتار دیا مگر دوسرے ہی لمحہ اُس نے اپنے دل پہ قابو پا لیا۔ وہ تکیہ پہ سے اپنا دوپٹہ اُٹھانے کے لئے جُھکی۔ اُسے تکیہ میں سے بھی ایک عجیب قسم کی بُو آئی۔ اُس کے قدم پیچھے ہٹ گئے اور اُس نے سنبھالا لینے کے لئے اپنا ایک ہاتھ لڑکی کے کندھے پہ رکھ دیا۔ لڑکی کے کرتہ سے کیلی کو ایک عجیب قسم کی بو آئی۔ ناک اور منہ کو دباتی کیلی چوکے میں چلی گئی اور کام میں جلدی سے اُلجھنے کے لئے اُس نے لسّی بلونی شروع کر دی۔ لسّی چھاننے کے لئے اُس نے جب ذرا دُور طاق پہ رکھا ہوا جھاڑن اُٹھایا تو اُس جھاڑن میں سے بھی کیلی کو ایک عجیب بُو آئی۔ کیلی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ آخر لکھے شاہ کے کرتہ کی بُو اُس کے سر کے دوپٹہ میں سے گذرتی تکیہ کے غلاف کو پار کرتی اور لڑکی کی قمیض سے ہوتی ہوتی لسّی کے اس جھاڑن تک

کیسے آ پہنچی تھی۔

دوپہر کو روٹی پکانے کے کام سے فراغت حاصل کر کے کیلی نے لسّی کا جھاڑن بچوں کے کپڑے تکیوں کے غلاف سب ایک جگہ اکھٹے کر لئے اس نے اپنے سر سے دوپٹہ اُتارتے ہوئے نکھے شاہ سے کہا کہ وہ اپنے گلے میں پڑا کرتہ بھی اُتار دے وہ "مہری" کو صابن کی ٹکیہ دے کر تمام کپڑے دُھلا لے گی۔

"یہ سالی مہری تو کپڑوں کا نام ونشان تک نہیں رہنے دے گی۔ ڈنڈے مار مار کر سارے بٹن توڑ دے گی۔ صابن الگ ضائع جائے گا۔ یہ مہریاں تو صابن ہی بہت لگاتی ہیں" نکھے شاہ نے فوراً کہا۔

کیلی چُپ کی چُپ رہ گئی۔ پھر نکھے شاہ نے بڑے سکون سے کہا "اندر صابن کا چورا پڑا ہے کڑاہی میں پانی گرم کر کے لڑکی کو صابن اُبال دو۔ وہ کپڑوں کو ایک دو تھپکیاں دے کر کھنگال دے گی"

کیلی نے سمجھا کہ نکھے شاہ نے کپڑے دھونے کا کام جو لڑکی کو سونپا ہے تو درحقیقت اُس کا اشارہ یہ ہے کہ وہ خود کپڑے دھولے ورنہ چار برس کی لڑکی کیا کپڑے دھو سکتی ہے اور پھر اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں تکلیف ہے کیلی نے کڑاہی میں صابن کا چورا اُبال لیا مہری سے دو گھڑے پانی منگوا لیا اور پھر کچے حوض پہ پتھر کی سِل رکھ کر وہ کپڑے دھونے لگی۔

نکھے شاہ بیٹھک میں بیٹھا ہوا اپنی آسامیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ جب

اُس نے کپڑے دھوتے جانے کی آواز سنی۔ لکھے شاہ دوڑتا ہوا آیا: "سنو! تم کیوں اتنی تکلیف کرتی ہو۔ لڑکی سے کہہ دو۔ آخر چھوٹے چھوٹے دو چار کپڑے ہی تو ہیں۔"

"اس ننھی سی جان سے کپڑے کہاں دھل سکیں گے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔ میں دھوتی جا رہی ہوں اور وہ اُنہیں چارپائی پر سوکھنے کے لئے ڈالتی جا رہی ہے۔" کیلی نے آہستہ سے کہا اور وہ دل ہی دل میں ذرا خوش ہوئی کہ لکھے شاہ نے پہلی بار اُس سے ذرا ہمدردانہ بات کی ہے۔

لکھے شاہ وہاں پھر بھی کھڑا رہا۔ کیلی جب صابن ملے پانی میں کپڑا بھگوتی اور انہیں ہاتھوں سے ملتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے لکھے شاہ کے دل پر ضرب پڑ رہی ہو۔ وہ دو منٹ تک تو لب بھینچ کر کھڑا رہا اور پھر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ بولا "سنو۔ تم خود سیانی ہو تمہارے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن ہیں۔ اتنا سارا میل تو کپڑوں سے نہیں نکلے گا۔ جتنے یہ کنگن گھس جائیں گے۔"

کیلی نے چونک کر لکھے شاہ کی طرف دیکھا پھر کپڑوں سے بہتے ہوئے میل کی طرف ——— اور پھر ہاتھوں میں پڑے ہوئے کنگنوں کی طرف۔ کیلی نے بڑی آہستگی سے دونوں کنگن اُتار کر لکھے شاہ کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

لکھے شاہ جب کنگنوں کی جوڑی سنبھال کر لے گیا تو کیلی کو یاد آیا کہ اس کے گاؤں میں نئی بیاہی لڑکی کو اس کی سہیلیاں یوں چھیڑا کرتی تھیں: "یہ

بازو بند بڑا زیور ہے۔ ہم آغوش کے وقت چھنک پڑتا ہے۔" اور کیلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔" جس نے یہ گیت لکھتے ہوئے بازو بند کو بڑا زیور بنایا ہوگا۔ اُسے یہ خبر نہیں تھی کہ جب کوئی میل سے لتھڑے ہوتے کپڑے دھونے لگتا ہے تو زیور سائس گھڑی بھی بڑے سے ہو جاتے ہیں۔"

ایک تو کالے کا رنگ قدرتی طور پر سیاہ تھا۔ مگر زیادہ تر اُس کا رنگ روپ اُس کی ضد نے بگاڑ رکھا تھا۔ کیلی اُس سے نہلانے کے لئے کہتی تو وہ کھسک جاتا۔ کیلی اُس سے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہتی تو وہ بگڑ کر اپنے کرتے سے ہاتھ پونچھ لیتا اور میلے کپڑوں کو اور بھی میلا کر دیتا۔ کیلی اُس سے کہتی کہ وہ اپنی پھٹی ہوئی جوتی مرمت کرا لے تو وہ جوتی کو اور بھی زور سے گھسیٹتا اور جوتی کو زیادہ پھاڑ لیتا۔ آج بھی جب کیلی بچوں کو نہلا رہی تھی تو اُس کالے کے ہاتھوں پریشان ہو رہی تھی اُس وقت کیلی کے میکے کا ایک شخص اس کے لئے ایک رقعہ لے کر آیا۔

کیلی نے اُس کارندے کے لئے ایک پیڑھی بچھا دی اور ماں باپ کی خیریت پوچھتے ہوئے وہ لڑکی کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ جیسے وہ رقعہ پڑھنے کی اُسکو کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی عباس پور سے اُس کے والدین کے دو پیغام اُسے موصول ہو چکے تھے۔ جب سے وہ شادی کے بعد گھر کا پہلا چکر لگا کر آئی تھی دوبارہ اپنے گاؤں نہیں گئی تھی۔

"کیلی - بیٹیا - ماں تو جدائی میں تڑپ رہی ہے تو نے اپنا دل پتھر کا کیوں کر

لیا ہے؟" کارندے نے پنیوں کا پٹارا کیلی کے سامنے رکھ دیا اور جھاڑن کے پلو میں بندھا ہوا رقعہ کھولنے لگا۔

"نہیں۔ بھیا۔ یہ بات نہیں، تم خود ہی دیکھ لو۔ اگر میں ایک روز کے لئے بھی یہاں سے چلی جاؤں تو سارا گھر تہ و بالا ہو جائے" کیلی نے لڑکی کے بالوں کے اُلجھاوے دُور کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

کارندہ سوچ رہا تھا۔ کیلی جو کل دانے بھونتی تھی۔ ماں کو چڑاتی تھی اور اُس کے پلو سے ہاتھ پونچھ لیا کرتی تھی۔ دو دن میں کتنی سگھڑ سیانی ہو گئی ہے پھر کارندے نے اُس کی بچپن کی سہیلی کا واسطہ دیا "اب کے تو تمہیں جانا ہی پڑے گا۔ یہ گھر کے کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مترو کا بیاہ رچ گیا ہے۔ کل بھٹی تیار ہو جائے گی۔ یہ لو خط، مترو نے بھی اس پر دو جملے لکھ دیئے ہیں وہ تنہائی میں مجھ سے شرما کر کہتی تھی کہ کیلی میرے تھوڑے سے لکھے کو بہت جانے اور فوراً چلی آئے۔"

"مترو کا بیاہ؟ — کس کے ساتھ؟" کیلی جیسے بدک اٹھی۔ اُس نے بازو پھیلا کر کارندے سے رقعہ لے لیا۔

"اُن ہی "چالیسویں چک" والوں کے بیٹے کے ساتھ۔ بات بہت دیر سے چل رہی تھی" کارندے نے جب یہ بات کہی تو کیلی کا اشتیاق وہیں ختم ہو گیا۔ اُس نے بند کا بند رقعہ مونڈھے پر رکھ دیا۔ وہ بائیں ہاتھ کی انگلی پر لڑکی کے بال لپیٹ کر اُن کے اُلجھاوے دُور کرنے لگی۔

کارندہ جب لسی پانی پی کر بیرونی بیٹھک میں لکھتے شام کے منیم کے

پاس جا بیٹھا تو کیلی نے رقعہ پر ایک نظر ڈالی اور پھر جوں کی توں کام میں مصروف ہو گئی۔ وہ لڑکی کے بالوں میں کنگھی کر چکی تھی۔ اُس سے بڑے لڑکے کو نہلا کر اُسے کپڑے پہنا چکی تھی۔ اب اُس نے کچھ پیار سے اور کچھ خشمگیں انداز میں کالے کا بازو پکڑ لیا۔ "تو سب سے بڑا ہے۔ سب سے سیانا ہے۔ مگر تو سب سے زیادہ ضد کرتا ہے۔"

"میں خود ہی کنوئیں پر نہا آؤں گا" کالے نے کہا اور بازو چھڑانے کے لئے زور لگانے لگا۔

"میں تجھ پر روز اعتبار کرتی ہوں۔ لیکن آج نہیں کروں گی" اور کیلی اُس کے گلے سے زبردستی قمیض اُتارنے لگی۔

"کیا خبر بھی ہے۔ میں گھر میں نہاؤں تو بابو ناراض ہوتا ہے۔ مہری کو کنوئیں سے پانی لانا پڑتا ہے وہ ایک گھڑے کے مہینہ میں چار آنے لیتی ہے" کالے نے جب یہ دلیل پیش کی تو اُسے پورا یقین تھا کہ کیلی اس دلیل کو رد نہیں کر سکے گی۔

"کوئی بات نہیں۔ ڈانٹ پڑے گی تو مجھے پڑے گی۔ تجھے تو نہیں پڑے گی۔ ذرا اپنے پیروں کی طرف دیکھ۔ ان پر میل کی کیسی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔" اور کیلی نے اُس لڑکے کو زبردستی پتھر کی سل کے اوپر بٹھا کر پانی کا لوٹا اُس کے بدن پر انڈیل دیا۔

"نہلا لو۔ نہلا لو۔ مجھے باندھ کر نہلا لو۔ تم جب میکے چلی جاؤ گی تو میں بالکل نہیں نہاؤں گا۔"

کیلی کو ہنسی آگئی۔ وہ کالے کی پیٹھ ملتے ہوتے بولی "میں میکے نہیں جاؤں گی تو زور لگالے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم جاؤ گی"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟"

"تمہاری سہیلی کا بیاہ ہے"

کیلی کا جی چاہا کہ وہ کہے "اگر میری سہیلی کی سچ مچ شادی ہوتی تو میں اُڑکر جاتی۔ یہ تو جھوٹی شادی ہے" لیکن کیلی نے سرد آہ بھر کر صرف اتنا کہا "تو دیکھ لینا۔ میں بالکل نہیں جاؤں گی"

کیلی نے لڑکے کے گھٹنوں کو زور سے ملا۔ ایڑیوں کو زور سے ملا اور پھر اُس کا بدن پونچھ کر اُسے دُھلا ہوا کرتہ اور پاجامہ پہنا دیا۔ کیلی نے ماں کا بھیجا ہوا پٹارا کھولا اور ایک ایک پنی تینوں بچوں کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ تازہ پنی کی لذت نہ جانے کس طرح کالے کے منہ میں گھل گئی۔ اُس کے دل میں جمی ہوئی ایک بات پگھل گئی "تم میکے کیوں نہیں جاتیں۔؟" کالے نے پوچھا۔

"میری غیر حاضری میں تمہیں کون نہلائے گا؟ کون تمہیں روٹی پکا کر کھلائے گا؟ کون تمہیں اسکول بھیجے گا؟"

"مہری روٹی پکائے گی پہلے بھی تو وہی پکایا کرتی تھی"

"تو ایک دن خود ہی تو کہہ رہا تھا کہ مہری بہت ہی خراب سالن بناتی ہے۔"

"وہ تو میں نے کہا تھا مگر اندر کی بات مجھے معلوم ہے"

"تجھے کیا معلوم ہے؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔"

"راجا بیٹا ہے۔ بتا دے نا۔"

کیلی آج حیران تھی کہ یہ کالا جو اب اُس سے سیدھے منہ بات نہیں کیا کرتا تھا۔ آج اُس سے اتنی باتیں کر رہا تھا اس لئے کیلی نے اُس کے قریب جا کر اُس کے کندھے پر تھپکیاں دیں اور پھر کہا "بتا دو نا۔ کیا بات ہے۔"

"ایک پنی اور دو۔ پھر بتاؤں گا۔"

کیلی نے پٹارے میں سے ایک پنی نکال کر کالے کو دے دی۔ کالا کچھ حیران ہوا اور پھر اُس نے کہا "میرا تو یہ خیال تھا کہ تم مجھے اور پنی نہیں دو گی۔"

"کیوں؟"

"تمہارے لئے تھوڑی رہ جائیں گی۔"

"کیلی کو ہنسی آگئی اور وہ کہنے لگی "پنیاں تو بچوں کے لئے ہوتی ہیں"

"بچوں کے لئے تو ہوتی ہیں مگر۔ . . ."

"مگر کیا جو کہنا چاہتا ہے کہہ کیوں نہیں دیتا"

"ہم کوئی تیرے بچے تھوڑے ہی ہیں"

"کیلی کی ہنسی اُس کے ہونٹوں پر جم گئی۔ کالے کا چہرہ بھی پھیکا پڑ گیا اور پھر وہ روہانسی آواز میں کہنے لگا "کیا میں نے جھوٹ کہا ہے؟"

لڑکی بالوں میں کنگھی کروا کر اور ایک پنی لے کر کھیلنے چلی گئی تھی۔ لیکن دوسرا لڑکا کالے کی دیکھا دیکھی کیلی سے دوسری پنی مانگنے لگا۔ کیلی نے ایک

پنی اُسے بھی اُٹھا کر دی اور اُس کا جی چاہا کہ وہ پنیوں کا پٹارا ان لڑکے لڑکیوں کے سامنے رکھ دے اور خود کہیں چلی جائے۔

"میں ساری بات جانتا ہوں،" لڑکے نے پھر ڈھٹائی سے کہا۔

"تو کیا جانتا ہے؟" کیلی نے پوچھا۔ اُس کی آواز بجھی بجھی سی تھی۔

"جب تمہارے یہاں اپنے بچے ہو جائیں گے تو تم ہمیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دو گی،" کالے نے یوں یقین کے ساتھ کہا جیسے وہ کسی پنڈت سے اپنی جنم پتری دکھا کر آیا ہو۔

"یہ بات کالے کی اپنی سوچی سمجھی نہیں ہے" کیلی بھانپ گئی یہ بات تو ایسی ہی تھی جیسے کوئی بچہ اپنے باپ کی قمیض پہن لے اور وہ قمیض اس کے پیروں تک لٹک رہی ہو۔

"یہ بات تم سے کس نے کہی ہے۔؟"

"مجھے خود ہی معلوم ہے۔"

"میں جانتی ہوں کہ تجھے یہ بات کس نے سکھائی ہے۔"

"میری تائی جھوٹ نہیں بولا کرتی۔"

کیلی کی ہنسی چھوٹ گئی ہے ایک تو اس بات پر کہ کالا ابھی ناپختہ تھا اور دوسرے اس بات پر کہ یہ ساری بات ہی اُسے مضحکہ خیز معلوم ہوئی تھی ویسے اُسے پتہ چل گیا کہ جب سے وہ آئی تھی کالا اُس سے کیوں سرد مہری سے پیش آتا تھا۔ بڑے سکون کے ساتھ کیلی نے اُس سے کہا "تو کون سی جماعت میں پڑھتا ہے؟"

"تیسری میں"

"تو پھر کیا تو نے ابھی تک یہ نہیں پڑھا کہ جس دودھ میں مکھی پڑ جاتی ہے اُسے پھینک دیتے ہیں۔ وہ دودھ پیا نہیں جاتا۔ وہ دودھ پی لیا جائے تو آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔"

"میں نے یہ پڑھا ہے؟"

"پھر۔ اگر میں تمہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دوں گی تو دودھ بھی پھینک دوں گی۔ بھلا میں وہ دودھ پی کر کیا کروں گی۔"

جنر نہیں کالے کی سمجھ میں وہ بات آئی کہ نہیں لیکن یہ بات کہہ کر کیلی کو اطمینان ضرور ہو گیا۔

"سالو۔ یہ کیا اُدھم مچا رہے ہو؟" لکھتے شام نے بیرونی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے اندر کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

اصل میں بات یہ تھی کہ کل چھوٹی بلّو نے ضد کر کے اپنے کان چھدوا لئے تھے۔ آج جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کانچ کی گولیوں سے کھیل رہی تھی تو لولا بار بار ٹھوکر مار کر ان کا کھیل خراب کر دیتا تھا اور بلّو کو اس طرح اپنی باری سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ بلّو نے غصّہ میں لولے کے ایک طمانچہ رسید کر دیا اور لولے نے جوش میں آکر بلّو کا کان کھینچ لیا تھا۔ نئے چھدے ہوئے کان سے خون بہنے لگا۔ لہو دیکھ کر لولا بھی بلّو کی طرح رونے لگا۔

کیلی نے تیل گرم کر کے بلّو کے کانوں پر لگایا اور اُسے چارپائی پر لٹا کر جن اور پری کی کہانی سُناتے ہوئے اُس کا دھیان دوسری طرف لگانے لگی۔

۔ بلو کو ابھی پرچایا نہیں جا سکا تھا کہ لوبے نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اپنی طرف سے وہ چارہ کترنے لگا تھا کہ اُس کے ہاتھ کی اُنگلی سے لہو کی دھار چھوٹ پڑی۔

"حرامیو۔" لکھے شاہ غصّہ میں پھنکارتا ہوا اندر آگیا اور اُس نے دھڑا دھڑ لوبے کو پیٹنا شروع کر دیا۔

کیلی نے بڑی مشکل سے لڑکے کو اس کے باپ کے چنگل سے چھڑایا اور اُس کے ہاتھ پر پٹی باندھتے ہوئے لکھے شاہ سے کہنے لگی۔ "بچے کبھی نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ بیکار بیٹھ کر اگر وہ کچھ سنواریں گے نہیں تو کچھ بگاڑیں گے ضرور۔ اسے اسکول کیوں نہیں بھیج دیتے؟"

"یہ کیا پڑھے گا۔ خاک۔ سالی سلیٹیں ہی توڑے گا۔ . . ."

"پھر کیا ہوا۔ اسکول جائے گا تو سلیٹ ہی توڑے گا نا۔ گھر میں بیٹھ کر تو وہ اپنی ہڈیاں توڑتا ہے۔"

"سالا اسکول بھی تو ریلوے لائن کے پار ہے۔ اسے لائن کون پار کرائے گا۔ گاڑی کے نیچے آکر پس جائے گا۔"

لکھے شاہ کے گھر سے اسکول دُور نہیں تھا۔ لیکن بیچ میں ریلوے لائن پڑتی تھی۔ کیلی نے بڑے سکون سے کہا۔ "اسے لائن پار کرانا میرا ذمہ رہا۔ صرف دو قدموں کا فاصلہ ہے۔ یہ کسی کام میں تو مصروف رہے گا۔ اگر کہو۔ تو لڑکی کو بھی داخل کرا آؤں۔؟"

"لڑکی کو تو ابھی ناک پونچھنے کی بھی تمیز نہیں۔ سالا قاعدہ کیا اٹھائے گی"

لکھے شاہ نے ایک بار یوں کہا اور پھر کہنے لگا۔" اچھا تو اُسے بھی اسکول میں داخل کرا آؤ۔ اگر پڑھے گی نہیں تو اُستانی کا دماغ تو چاٹے گی" اور لکھے شاہ نے مُڑتے مُڑتے کہا۔" سنو۔ ذرا چوکس رہنا۔ یہ اُستانیاں لوٹتی بہت ہیں۔ لڑکا یا لڑکی اچھے گھر کے ہوں تو سالی دوگنی فیس لگا دیتی ہیں۔"

لکھے شاہ واپس چلا گیا۔ کیلی نے کچھ نہ کہا۔ مگر وہ کتنی ہی دیر تک گھٹنوں میں سر دیے کہ لکھے شاہ کے ان دلائل کے بارے میں سوچتی رہی وہ نہ جانے اور کتنی دیر تک سوچتی رہتی کہ اُسے کھٹ کھٹ کھڑاؤں کی آواز سنائی دی۔ گھر میں صرف لکھے شاہ کا باپ کھڑاؤں پہنتا تھا اور وہ دالان میں ذرا کم ہی آتا تھا کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں اُس کی بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے "کوڈے شاہ پیچوں کی ملیاں والا" کہا جاتا تھا اور کوڈے شاہ کا نام سُن کر لوگ سہم جایا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے" جس جگہ سے کوڈے شاہ گزر جاتا ہے وہاں قیامت گزر جاتی ہے" لوگوں میں یہ کہاوت بھی مشہور تھی کہ جو شخص کوڈے شاہ کے پاس اپنا مکان رہن رکھ دیتا ہے وہ اپنی سات نسلیں گروی رکھ دیتا ہے۔ کوڈے شاہ کے نام کا دبدبہ تو اب بھی تھا۔ مگر وہ اپنی آنکھوں کی وجہ سے لاچار ہو گیا تھا۔ اب اُسے بہی کھاتوں پہ لکھے ہوئے نام دکھائی نہیں دیتے تھے اور اُس نے اپنا سارا کاروبار اپنے بیٹے کو سونپ دیا تھا۔ لکھے شاہ اگرچہ کاروبار میں اپنے باپ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ مگر اُس نے اپنے باپ کے نام سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اپنے نام کے ساتھ اس کا نام بھی جوڑ رکھا تھا۔" لکھے شاہ ولد کوڈے شاہ"

مکھے شاہ کا باپ کوڈے شاہ جو کٹورے میں پانی منگوا کر باہر چارپائی پر بیٹھ کر کلی کر لیا کرتا تھا اور لڑکی کے ہاتھ لسی منگوایا کرتا تھا۔ ہاتھوں سے دیواروں کو ٹٹولتا اور کھٹ کھٹ کرتا۔ اندر کے دالان میں آیا تو کیلی حیران رہ گئی۔

"بٹیا۔ ذرا میری اس قمیض پر ایک نظر تو ڈالو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے مجھے جوئیں کاٹتی ہوں" کوڈے شاہ بولا اور اُس نے گلے سے قمیض اُتار کر کیلی کے آگے کر دی۔

کیلی نے قمیض کو اُلٹا کر بخیوں کو کُریدا اور بولی۔ "جوئیں تو قطار باندھ کر چل رہی ہیں۔" اور کیلی کو محسوس ہوا کہ جیسے کوڈے شاہ کی ساری آسامیاں اُس پر جوئیں بن کر چڑھ گئی ہوں۔"

"میں بھی کہوں کہ رات بھر کون میرے بدن کو توڑ توڑ کر کھاتا ہے۔ کوڈے شاہ نے کہا اور پھر چارپائی پر بیٹھ کر اندر کی بنڈی اُتارنے لگا۔ کوڈے شاہ نے بنڈی اُتاری۔ اپنی گردن اچھی طرح ٹٹولی کہ کہیں بنڈی کے ساتھ سونے کی زنجیر بھی نہ اُتر گئی ہو۔ کیلی نے جب کوڈے شاہ کے ہاتھ سے اُس کی بنڈی پکڑی تو اُس کا جی چاہا کہ وہ کہے "باپو لاؤ سونے کی زنجیر بھی اُتاروں۔ ذرا دیکھوں کہ اُس پر بھی تو جوئیں نہیں چڑھ گئی ہیں۔"

کیلی دونوں بچوں کی اُنگلی پکڑ کر اُنہیں ریلوے لائن پار کرا دیتی اور اُن کے قاعدے اور ان کی سلیٹیں اُن کے ہاتھ میں تھما کر انہیں اسکول روانہ کر دیتی۔ سامنے تھوڑے سے فاصلے پر دونوں اسکول تھے۔ لڑکوں کے اسکول کا دروازہ بھی اس طرف تھا اور دُور کھڑی کیلی کو لڑکا اسکول کے دروازے میں داخل ہوتا ہوا بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ لڑکیوں کا اسکول ذرا دُور تھا۔ لیکن چھوٹی لڑکی ذرا ہوشیار تھی اور کیلی کو بھروسہ ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنے آپ اسکول جا پہنچے گی۔ کیلی اُس وقت تک اسٹیشن کے جنگلے کے قریب کھڑی رہتی۔ جب تک اُسے دونوں بچے اسکول کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے نظر نہ آجاتے اور پھر چھٹی کے وقت بھی یوں ہی ہوتا۔ کیلی اسٹیشن کی دوسری طرف جا کھڑی ہوتی۔ دونوں بچے آتے کیلی اُن کے قاعدے اور ان کی سلیٹیں پکڑ لیتی اور پھر انہیں اُنگلی سے لگا کر ریلوے لائن پار کرا لاتی۔ اُس نے دونوں کو ہدایت کر رکھی تھی۔ کہ اگر اُسے کبھی پانچ منٹ کی دیر بھی ہو جائے تو وہ دوسری طرف کھڑے ہو کر اُس کا انتظار کیا کریں اور اکیلے کبھی ریلوے لائن پار نہ کیا کریں۔ ایک دن کیلی اسٹیشن کے

جنگلے سے پیٹھ لگا کر دونوں بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ کب وہ اسکول کی حدود میں داخل ہوں اور وہ گھر لوٹے کہ اُسے پچھلی طرف سے ایک دھیمی آواز سنائی دی۔

"بی بی۔ تیری تو قمیض خراب ہوگئی۔"

کیلی نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کوئی اُس سے کہہ رہا تھا "جنگلے کا رنگ ابھی گیلا تھا۔ تیری قمیض پہ رنگ لگ گیا ہے" یہ بات کہنے والے کے ایک ہاتھ میں رنگ کا ڈبہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں برش تھا۔

کیلی نے گردن موڑ کر اپنی پیٹھ کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اُسے اپنی قمیض کی پیٹھ پر لگا ہوا رنگ دکھائی نہیں دے سکتا تھا اس لئے وہ رنگ کرنے والے کی قمیض کی طرف دیکھنے لگی جس پر کئی جگہ جنگلے والا سبز رنگ لگا ہوا تھا۔ قمیض پر، پاجامے پر، تھوڑا سا ہاتھوں پر، تھوڑا سا گردن پہ اور تھوڑا سا حلق پر۔

"مٹی کے تیل سے اُتار کر دیکھنا۔ ہاتھ اور پیر پہ لگا ہوا رنگ ذرا مشکل سے اُترتا ہے۔" رنگ ساز بولا اور ذرا دُور ہٹ کر جنگلے پر رنگ کرنے لگا۔

کیلی جب گھر آئی۔ اُس نے قمیض اتار کر اُس کی پیٹھ کی طرف دیکھا "پیلی قمیض پہ جیسے سبز پھول کاڑھے ہوئے ہوں۔"

"مٹی کے تیل سے اُتار کر دیکھنا" اُسے رنگ ساز کی بات یاد آئی اور وہ چولہے سے مٹی کے تیل کی بوتل اُٹھا لائی۔

ایک چھوٹا سا چیتھڑا مٹی کے تیل میں بھگو کر قمیض پہ پھیرنے لگی تو اس کا ہاتھ رک گیا۔ یہ سبز پھول اُدھڑ جائیں گے۔ اُس نے چیتھڑا پھینک دیا اور مٹی کے تیل کی بوتل دوبارہ چوکے میں رکھ آئی۔

دوپہر کو جب وہ چھٹی کے وقت بچوں کو گھر لانے کے لئے اسٹیشن کی طرف جانے لگی تو اُس نے پھر وہی قمیض پہننے کے لئے اٹھا لی اور اُس کا جی چاہا کہ وہ قمیض کی پیٹھ والی طرف آگے کر لے اور اگلی طرف پیچھے کی جانب کر لے تاکہ اُسے سبز پھول نظر آتے رہیں۔

قمیض اُس نے اُلٹی کر کے نہ پہنی لیکن جب وہ اسٹیشن پہ پہنچی تو وہ اپنے بازو پھیلا کر جنگلے سے لگ گئی۔ کچھ رنگ اُس کے ہاتھوں پہ لگ گیا اور کچھ قمیض کے سینے پر۔

اور کیلی کی آنکھیں جہاں تک جنگلہ جاتا تھا کچھ ڈھونڈھنے لگیں۔ اس وقت جنگلے کے قریب کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ جانے وہ رنگ کا ڈبہ اور وہ کوہجی کہاں چلی گئی تھی۔ صرف اس کو لگایا ہوا رنگ جنگلے پہ باقی رہ گیا تھا اور کچھ کیلی کی قمیض پر۔

اسٹیشن کے باہر ایک بہت بڑے برگد کے نیچے چائے کی ایک دوکان تھی۔ برگد کے تنے کے قریب بیٹھا ہوا ایک شخص آہستہ سے اُٹھا اور جنگلے کی طرف آیا۔ قمیض پہ سے رنگ اُترا تو نہیں ہوگا۔

کیلی نے یوں دیکھا جیسے وہ ایک ننھی سی لڑکی ہو اور اُستاد نے اُسے تختی لیپنے کا حکم دیا ہو اور اُس نے تختی لیپنے کی بجائے اُس پر سیاہی سے اور بھی دھبے ڈال لئے ہوں۔ کیلی نے اپنی دونوں بانہیں سکیڑ کر اپنے ہاتھوں اپنے بازوؤں اور اپنے سینے پر لگے ہوئے نئے رنگ کو چھپا لیا۔

"میں نے اُتارا ہی نہیں" کیلی نے آہستہ سے کہا۔

"ذرا سا مٹی کا تیل لگا کر دیکھتا تھا"

"مٹی کے تیل سے بُو آتی تھی"

رنگ ساز ہنس پڑا۔ "رنگ میں سے بھی تو بُو آتی ہے۔ اس میں السی کا تیل ہوتا ہے۔"

"اس کی بُو بُری نہیں لگتی" کیلی نے جوں توں کر کے اتنی بات کہہ دی اور پھر منہ پھیر لیا۔

"بہت سے لوگوں کو رنگ کی بُو بھی بُری لگتی ہے۔"

"کیا تمہیں بُری لگتی ہے کہ نہیں"؟ کیلی نے حیران ہو کر کہا اور پھر دوبارہ منہ اُس کی طرف پھیر لیا۔

"نہیں مجھے تو بُری نہیں لگتی۔ بلکہ مجھے تو اچھی لگتی ہے کہ وہ میرے فن کا حربہ ہے۔ جس شخص کو اپنے فن سے محبت ہوتی ہے اُسے اُس فن کے اوزاروں سے بھی پیار ہوتا ہے۔ جیسے بڑھئی کو آری سے۔ مزدور کو کدال سے

اور کسان کو ہل سے۔"

" اور ساہوکار کو سود سے؟" کیلی کے منہ سے نکلا۔

" میں ساہوکار سے کو فن نہیں سمجھتا۔ میں تو فن اس چیز کو مانتا ہوں جو لوگوں کو کچھ سنوارے۔ ساہوکار کا روپیہ لوگوں کو اتنا سنوارتا نہیں ہے۔ جتنا بگاڑتا ہے ساہوکارہ جونکوں اور کھٹملوں کا فن ہے۔"

کیلی کا سارا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا اور جب وہ اپنے ماتھے کو پونچھنے لگی تو اس کے ہاتھ پہ لگا ہوا رنگ، اس کے بازوؤں پہ لگا ہوا رنگ اور اُس کے سینے پہ لگا ہوا رنگ بے نقاب ہو کر سامنے آگیا۔

" تمہاری قمیض؟" رنگ ساز نے کیلی کی قمیض کی طرف دیکھا۔

" تمہاری قمیض؟" کیلی نے رنگ ساز کی قمیض کی طرف دیکھا۔

اور پھر دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک قمیض دوسری قمیض سے ہم آغوش ہو گئی ہو۔ دونوں کے چہرے تمتما اُٹھے۔ دونوں کی قمیضوں پہ پڑے ہوئے سبز پھول ہنسنے لگے۔

دوسرے دن جب کیلی بچوں کو انگلی سے لگا کر اسٹیشن کے قریب پہنچی تو گاڑی کی چیخ سنائی دی اور پھر چھک چھک کرتے ہوئے انجن کی آواز سنائی دی۔ گاڑی اسٹیشن پر آگئی پہلے جب کیلی وہاں پہنچتی تھی تو یہ گاڑی گزر جایا کرتی تھی۔ آج بھی وہ اپنے وقت پر آئی تھی۔ لیکن گاڑی لیٹ تھی۔

گاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی اس لئے دوسری طرف کا جنگلہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اگرچہ کیلی کو معلوم تھا کہ گاڑی ایک دو منٹ میں چلی جائے گی، پھاٹک کھل جائے گا اور وہ دوسری طرف کے جنگلہ کی جانب جا سکے گی۔ مگر ایک ایک منٹ کیلی پر بھاری ہو گیا۔

کیلی کی زندگی میں یہ پہلا دن تھا۔ پہلی گھڑی اور پہلا پل تھا جب کیلی کو یہ محسوس ہوا تھا کہ جس طرح ندیوں میں باڑھ آجاتی ہے۔ اُسی طرح اُس کی رگوں میں خون کا سیلاب آگیا تھا اور ساری سوچیں اُس سیلاب میں تنکوں کی طرح بہہ رہی تھیں۔ خیالوں کی حدود اس پانی میں ڈوب گئی تھیں۔ پانی پُل

کے اُوپر سے بہہ رہا تھا۔ گاڑی کے اُوپر سے بہہ رہا تھا۔

گاڑی چلی گئی۔ آنکھوں کے آگے سے اوٹ ہٹ گئی۔ سامنے کوئی جنگلے پر رنگ کرتا ہوا یوں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے پیچھے سے کوئی آنے والا ہو کیلی کے پاؤں اگرچہ ریلوے لائن کی اس طرح تھے۔ مگر اس کی مسکراہٹ لائن کی دوسری طرف پہنچ گئی تھی۔

دونوں بچے جب اپنا اپنا قاعدہ اور اپنی اپنی سلیٹ لے کر سامنے میدان میں ہو لئے تو رنگ ساز نے رنگ کا دوسرا کوٹ شروع کرتے ہوئے کہا" کیلی تم اپنے بھائیوں اور بہنوں کی کس پابندی اوقات کے ساتھ خدمت کر رہی ہو۔ دونوں وقت انہیں چھوڑنے اور انہیں ساتھ واپس لے جانے آتی ہو۔"

"بھائی اور بہن۔ کون سے بھائی بہن۔؟" کیلی کی آنکھیں جنگلے کے گہرے سبز رنگ میں کھو گئیں۔ "یہ میرے بھائی بہن نہیں ہیں۔"

"یہ تمہارے بہن بھائی نہیں ہیں۔ پھر کیا ہیں۔؟"

"یہ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ کہ یہ میرے کون ہیں؟" کیلی نے آہستہ سے کہا اور پھر اُسے خیال آیا کہ اُس کو اس کے نام کا کہاں سے پتہ چل گیا تھا۔ یوں سنئے تو اُسے اپنا نام نہیں بتایا تھا وہ بولی۔ "تم نے یہ بنجوم کہاں سے لگایا۔؟"

"بنجوم"

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا۔؟"

"معلوم نہیں ہوا۔ پڑھا ہے"

"کہاں پڑھا؟"

"تمہارے بازو پر پڑھا وہ سامنے تمہارے بازو پہ تمہارا نام کھُدا ہوا ہے۔"

"میرے بازو پر۔؟" کیلی ہنس پڑی اور بولی "میرے ماتھے پر" مگر کیلی کی زبان دفعتاً رک گئی۔ اگلی بات بیل بن کر اُس کی زبان پہ جم گئی۔ "میرے ماتھے پر تو میری تقدیر کھُدی ہوئی ہے اور وہ تم سے پڑھی نہیں جائے گی۔"

رنگ ساز کے ہاتھ سے کوچی چھوٹ گئی اور نیچے مٹی پہ گر پڑی۔ اُس نے صرف اتنا کہا "تم نے بچپن میں اپنے بازو پر اپنا نام کھُدوایا ہوگا۔؟"

"میں بچپن میں ایک بار اپنے باپ کے ساتھ ایک میلے میں گئی تھی ننکانے کے میلے۔ وہاں میرے باپ نے میرے بازو پر میرا نام کھُدوا دیا۔ شاید اس لئے کہ میں اگر میلے میں گم ہو جاؤں تو کوئی میرے بازو پر میرا نام پڑھ کر بلند آواز سے پکارے تو میرا باپ مجھے ذرا ڈھونڈ لے۔"

رنگ ساز نے کوچی مٹی پر سے اُٹھائی اور تیل میں ڈبوتے ہوئے بولا۔ "عجیب بات ہے۔ میں بھی ایک بار بچپن میں ماں کے ساتھ ننکانے گیا تھا۔ ننکانے کے میلے۔ وہاں میری ماں نے میرے بازو پر میرا نام کھُدوایا تھا۔"

" رنگ ساز نے اپنا دایاں بازو آگے بڑھا دیا۔ کیلی نے پڑھا۔ اُس پر لکھا ہوا تھا، " دیپک۔"

" دیپک۔"

" کیلی۔"

دونوں نے ایک دوسرے کے بازو پہ ایک دوسرے کا نام یوں پڑھا جیسے یہ دنیا نکلنے کا میلہ تھا اور دونوں اس میلہ میں گم ہو گئے تھے اور آج دونوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈھ لیا تھا۔

یہ دن، یہ گھڑی، یہ پل کیلی کو یوں محسوس ہوا کہ اس میلہ میں ایک ہنگھوڑا گڑا ہوا تھا اور کیلی نے اُس میں اپنی ساری عمر کو بٹھا کہ ایک ہلکورا دے لیا ہو۔ اور وہ اس دن کی، اس گھڑی اور اس پل کی ممنون ہو۔ اگلے دن، اگلی گھڑی اور اگلے پل اُسے اس ہنگھوڑے میں سے اُتر جانا تھا۔ اس میلے میں سے چلے جانا تھا۔ اس بات کا کیلی کو کوئی غم نہیں تھا۔ اُس نے جشن منا لیا تھا۔ تقدیر والی بات اگر زبان کے میل کی طرح کیلی کی زبان پہ جمی ہوئی تھی تو بھی اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس نے اس میلے کی مٹھائی چکھ کر دیکھ لی تھی اور اس نے جشن منا لیا تھا۔

دوپہر کو چھٹی کے وقت جب کیلی بچوں کو گھر واپس لانے کے لئے اسٹیشن پر آئی تو موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے آگے ایک بنچ پڑا ہوا تھا۔ بارش سے بچاؤ صرف وہیں ہو سکتا تھا اور کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔ مگر کیلی کے پہنچتے پہنچتے وہ بنچ خالی نہ رہا۔ شاید کسی گاڑی کے آنے کا وقت تھا۔ اسٹیشن پر آٹھ دس مسافر آئے ہوئے تھے۔

دیپک اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے باہر آیا تو بارش میں بھیگتی ہوئی کیلی کو اُس کمرے میں لے گیا۔ کیلی نے کمرے کی کھڑکی میں سے اسکولوں کی طرف دیکھا اُسے کہیں کوئی بچہ نظر نہ آیا۔ سب بچے بارش کی وجہ سے اسکولوں کے اندر ہی ٹھہر گئے تھے۔

”کیلی۔ کرُسی پر بیٹھ جاؤ۔ جب تک بارش نہیں رکتی تب تک بچے باہر نہیں آسکتے۔“ دیپک نے کہا اور کیلی ایک کرُسی پر بیٹھ گئی۔

”دیپک۔ کیا تم اس رنگ سے بھلا کچھ نام بھی رکھ سکتے ہو؟“ کیلی نے پوچھا۔

دیپک مسکرا دیا۔ ”ہاں۔ جیسے نام کہو لکھ سکتا ہوں۔“

”میرا مطلب ہے تختے پر نام رکھ سکتے ہو؟“

”بورڈ پر؟“

”ہاں۔“

”لکھ دوں گا۔“

" اصل میں بات یہ ہے کہ آج صبح شاہ نے کہا تھا" کیلی نے یہ بات کہی اور سوچ میں ڈوب گئی کہ اب دیپک مجھ سے پوچھے گا یہ شاہ (بیلٹھ) کون ہے؟ وہ تیرا کیا ہوتا ہے؟ اور مجھے اپنی تقدیر والی ساری بات سنانی پڑ جائے گی۔ لیکن دیپک نے کچھ نہ پوچھا اور کیلی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
" مجھ سے تو نہیں کہا تھا مگر اپنے گماشتے سے کہا تھا کہ وہ لکڑی کے تختہ پر کسی سے اس کا نام لکھوا دے۔ یہ تختہ وہ اپنے گھر کے آگے لگوائے گا۔"

" تم جو کچھ کہو گی میں لکھ دوں گا کیلی"، اور پھر اس نے ہنس کر کہا: " اگر تم کہو تو تمہاری تصویر بھی بنا دوں"

" تصویر بھی۔ تم اس رنگ سے نہ جانے کیا کچھ بنا لیتے ہو۔"

" در حقیقت یہ میری لائن نہیں کیلی! نہ رنگ کرنا۔ نہ نام لکھنا۔ نہ تصویر بنانا۔ ویسے میں تھوڑا تھوڑا یہ سارے کام کر لیتا ہوں، میں اصل میں۔۔۔"

" تم کیا کہتے لگے تھے؟"

" میں لاہور میں نقشہ نویسی کا کام سیکھتا ہوں۔ گاؤں میں میری ماں بیمار تھی۔ چھٹی لے کر ماں کو دیکھنے آیا تھا۔ ماں ٹھیک ہو گئی۔ مگر چھٹیاں ابھی باقی ہیں مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ اسٹیشن کے جنگلوں پر رنگ کرنے کا تھوڑا سا کام مل گیا۔ میں نے وہ کام کر لیا۔"

کیلی نے حیران ہو کر دیپک کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا۔

"نقشہ نویس کا کیا کام ہوتا ہے۔؟"

"گھروں اور عمارتوں کے نقشے تیار کرنا۔ میں ایک بہت ہی غریب گھرانے کا لڑکا ہوں۔ کیلی۔ میری ماں نے بڑی مشکل سے مجھے دسویں تک پڑھایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں چھوٹی موٹی نوکری کر لوں اور چار پیسے کمانے لگوں مگر۔۔۔۔"

"پھر۔"

"مگر میں ابھی تک اپنی ماں کو کوئی سکھ نہ دے سکا۔ دُکھ ہی دُکھ دے رہا ہوں۔ گھر سے میں نوکری کی تلاش میں نکلا تھا۔ لیکن لاہور جا کر نقشہ نویسی کا کام سیکھنے لگا۔ ماں کو کچھ کما کر دینے کی بجائے اُس پر خرچے کا بوجھ اور بھی لاد دیا۔"

"اس کام میں کیا بہت خرچ ہوتا ہے؟"

"میرا اُستاد مجھ سے کچھ نہیں لیتا۔ مگر روٹی تو کھانی پڑتی ہے۔ میں چھٹیوں میں ہمیشہ تھوڑا بہت کام ڈھونڈھ لیا کرتا ہوں۔ گزشتہ گرمیوں میں ایک آرٹسٹ کے یہاں مجھے بورڈ لکھنے کا کام مل گیا تھا۔"

بارش تھم گئی۔ کیلی نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ سامنے بچے دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ کیلی کرسی پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور دیپک سے پوچھنے لگی۔ "اگر کل تمہیں فرصت ہو تو۔۔۔۔"

"کل صبح کی گاڑی سے میں یہاں سے چلا جاؤں گا کیلی۔ کل میری آخری چھٹی ہے۔ اسٹیشن کا کام بھی قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ اگر تم کہو تو میں ابھی تمہارے ساتھ چل کر....."

"اچھا تو ابھی سہی۔"

کیلی جب بچّوں کو انگلی سے لگا کر واپس چلی تو دیپک بھی اُس کے ساتھ تھا۔ کیلی نے چھوٹی لڑکی کے ذریعہ شاہ کی بیٹھک میں پیغام بھجوایا کہ وہ لکڑی کے تختہ پر جو نام لکھوانا چاہتا ہے لکھوا لے۔

شاہ نے بیٹھک میں سے باہر آکر دیپک کی طرف دیکھا اور بولا "یوں ہی تھوڑے سے حروف ہیں کتنے پیسے لو گے۔؟"

دیپک ہنس پڑا اور صرف اتنا کہا "یہ بتاؤ کہ لکھنا کیا ہے؟"

صرف دو حروف لکھنے ہیں "لکھے شاہ ولد کوڑے شاہ" شاہ کے چھدرے بے چھدرے بال اور بھی چھدرے ہو گئے۔

دیپک نے رنگوں کا ڈبہ نکالا۔ پھر برش نکالے اور گرد و پیش پر نظر ڈال کر خالی جگہ ڈھونڈھنے لگا۔

"پہلے یہ سالے پیسوں کی بات چکا لیں ورنہ بعد میں کتّی جھگڑے...."

شاہ کے گھنے ابرو اور زیادہ گھنے ہو گئے۔

"کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔" دیپک نے صرف اتنا کہا اور لکڑی کے تختے پر

پنسل سے لکھنے لگا۔ "لکھے شاہ ولد کوڈے شاہ۔!"

الفاظ میں جب دیپک رنگ بھر رہا تھا۔ تو کیلی ایک بار اُس کے قریب سے گزری اور کہنے لگی "کیا لکھا ہے ؟" اور پھر کیلی نے جھک کر تختے کی طرف دیکھا۔

"لکھے شاہ ولد کوڈے شاہ!" دیپک نے تختہ سیدھا کر کے کیلی کو دکھایا۔

"اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو جانتے ہو کیا لکھتی ؟" کیلی نے تن کر کہا۔

"کیا لکھتیں۔ ؟" دیپک نے آہستہ سے پوچھا۔

"دھیلا ولد پیسہ" کیلی نے کہا اور فوراً دیپک کے قریب سے دُور چلی گئی۔

دیپک کے ہاتھ سے بُرش گر گیا اور وہ کتنی دیر تک کیلی کی تنی تنی ہوئی پیٹھ دیکھتا رہا۔

رات ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ کیلی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ رات دھرتی کے بدن سے میل کی طرح چمٹی ہوئی تھی اور دھرتی کا انگ انگ چھپا رہا تھا۔ "نہ جانے کب دن نکلے گا۔ نہ جانے کب روشنی اس دھرتی کے بدن کو دھوئے گی۔" کیلی سوچنے لگی "صبح۔ اسٹیشن۔ دھرتی کا دھلا ہوا بدن۔ اور اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی خوشبو" اور کیلی کی سانسوں میں اس کے تصور نے ایک خوشبو سی گھول دی۔ یہ خوشبو ایک پھول کی خوشبو تھی۔ گلاب، موتیے یا کسی اور پھول کی خوشبو نہیں۔ روغنی پھول کی خوشبو۔ روغن بھی جیسے ایک پھول تھا جو کسی نے اپنے فن کی مٹی میں اگایا تھا۔

صبح جب کیلی بچوں کو انگلی سے لگا کر اسٹیشن کے راستہ پہ ہولی تو اس کے سرپٹ دوڑتے ہوئے خیالوں کے ایک ٹھوکر لگی "وہ شاید صبح سویرے ہی کسی گاڑی میں اپنے شہر چلا گیا ہو۔ میں اس سے پوچھنا ہی بھول گئی کہ وہ کس گاڑی سے جائے گا۔ تختہ پر نام لکھ کر وہ باہر ہی سے چلا گیا تھا۔ میں

بھی پاگل ہوں۔ وہ بھلا اندر کیونکہ آتا۔۔۔۔ میں بھی باہر کیسے جاتی۔اس وقت باہر کتنے ہی لوگ۔۔۔۔"

کیلی کی نظر نے قلانچیں بھرتے ہوئے اسٹیشن کی طرف دیکھا۔اِدھر کے پھاٹک کی طرف۔اُدھر کے پھاٹک کی طرف۔اِدھر کے جنگلے کی طرف۔اُدھر کے جنگلے کی طرف۔اور اُس کی نگاہ نے دیپک کی جھلک ڈھونڈھ لی۔

ریلوے لائن پار کر کے جب دونوں بچے اپنے اپنے اسکول کے راستہ پہ ہو لیے تو کیلی نے نگاہ بھر کے دیپک کی طرف دیکھا اور کہا۔

"مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ تم کہیں صبح سویرے کی گاڑی سے نہ چلے گئے ہو"

"تم سے ملے بغیر۔یہ تم نے کیوں سوچا تھا کیلی۔"

کیلی نے دیپک کی آواز کو ٹھنڈے پانی کے گھونٹ کی طرح پیا لیکن اس کی پیاس نہ بجھی۔اُس نے اس پانی کے کچھ اور گھونٹ بھرنے کے لئے کہا۔

"اگر آج اتوار ہوتا۔؟ اسکول میں چھٹی ہوتی اور مجھے اِدھر آنا ہی نہ ہوتا تو پھر۔۔۔؟"

"پھر۔اتوار آ کر یہاں بیٹھ تھوڑا ہی رہتا۔آتا گزر جاتا۔پھر سوموار آ جاتا اسکول کھل جاتا اور تم یہاں آ جاتیں۔"

"سچ۔۔۔!" کیلی نے دیپک کی آواز میں بھیگ کر اور سرشار ہو کر کہا۔

دیپک نے جنگلے کے ایک کنگرے کو اپنی مٹھی میں دبا رکھا تھا۔اُس نے

اپنی مٹی کو اور بھی کس لیا اور پھر جنگلے کو جھنجھوڑ کر دیکھا۔

" یہ کیا کر رہے ہو؟"

"ایک بات دیکھ رہا ہوں"

"کیا ــــ؟"

" اگر لوہے کا یہ جنگلہ مجھے کبھی توڑنا پڑ جائے تو کیا میں اُسے توڑ سکوں گا یا نہیں ــــ!"

" یہ جنگلہ؟"

" جنگلے حفاظت بھی کرتے ہیں جنگلے قید بھی کرتے ہیں۔ جب یہ حفاظت کرتے ہیں تو ان کی خیریت معلوم ہوئی ہے۔ لیکن جب یہ قید کرتے ہیں تو توڑنا بھی پڑتا ہے۔"

" ٹھیک ــــ!"

" میرے اور تمہارے درمیان سماج نے ایک جنگلہ لگا دیا ہے۔"

کیلی کے ہونٹوں پر نہ جانے کیا آیا۔ جو کچھ بھی آیا اُس سے کوئی لفظ نہ بن سکا۔ وہ صرف اُس کے ہونٹوں پر ایک کپکپی بن کر رہ گیا۔

" ڈرو نہیں کیلی۔ جب تک کوئی بھی جنگلہ تیری حفاظت کرتا ہے میں اُس کی خیریت کا طلب گار رہوں گا۔"

کیلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بھی آگئی۔

مسکراہٹ جیسے رو رہی تھی اور آنسو ہنس رہے تھے۔

"کیا تم پھر کبھی اس راستے سے گزرو گے۔؟" کیلی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

دیپک کچھ کہنے لگا تھا مگر خاموش ہو گیا۔

"تم کیا کہنے لگے تھے؟"

"کہنے تو بہت کچھ لگا تھا لیکن ابھی صرف اتنا ہی کہوں گا کہ تم جب چاہو گی میں اس راستہ سے گزروں گا۔"

کیلی کا دل تشکر کے جذبہ سے شرابور ہو گیا۔

"کیا تم میری ایک چھوٹی سی بات مانو گے؟" کیلی نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔

"تم جو کہو۔"

کیلی نے دوپٹہ کے پلّو سے بندھا ہوا سونے کا کنگن کھولا اور دیپک کے حوالے کرتے ہوئے بولی "اگر اسے بیچ کر تمہارے تھوڑے سے دن سکھ سے گزر جائیں۔"

"کیلی ــــ!" دیپک نے چونک کر کہا۔

"یہ شاہ کے گھر کا نہیں۔ یہ میری ماں کے گھر کا ہے۔"

"کیلی۔ میرے پاس کھانے کو چاہے پوری روٹی نہ ہو مگر میرے پاس..."

"میں جانتی ہوں تمہارے پاس مکمل ضمیر ہے۔ خودداری ہے۔"

"تو پھر میرے ضمیر اور میری خودداری کو مکمل ہی رہنے دو۔"

"ایک بات پوچھوں دیپک۔ جب تمہاری ماں نے گھر کی کوئی چیز بیچ کر تمہیں پیسے دیئے ہوں گے۔ تمہیں کبھی خودداری کا خیال نہیں آیا ہوگا۔ چونکہ اُس چیز سے خودداری کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی تو وہ بھی اس کڑے وقت میں یوں ہی کرتی۔ . . . اگر تمہاری بیوی ہوتی — میں جانتی ہوں کہ میں تمہاری کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"یہ بات نہیں کیلی۔"

"خودداری کا سوال تو بیگانوں سے پیدا ہوتا ہے نا۔"

"کیا اپنے ہونے کا یہی ثبوت ہے؟"

"ہاں یہی ثبوت ہے۔"

"اچھا تو ثبوت دیئے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر دیپک نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ کنگن پکڑ لیا۔

ایک روز جب کیلی بچوں کو لاتن پار کرا کے انہیں اسکول کی جانب بھیج چکی اور خود پیچھے مڑنے لگی تو پھاٹک بند ہو گیا۔ گاڑی کے آنے کا سگنل ہو گیا کیلی پہلے تو کچھ منٹ تک پھاٹک کے قریب ہی کھڑی رہی لیکن وہاں دو چھکڑے آ کھڑے ہوئے۔ تین سائیکلوں والے آ کھڑے ہوئے ایک ریڑھی والا آ گیا اور کیلی اس بھیڑ سے پریشان ہو کر اور وقت گزارنے کے لئے اُس جنگلے کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔

منٹ منٹ بعد کیلی کھڑی ہو جاتی اور ہاتھ سے جنگلے کو سہلانے لگتی پھر اپنے آپ اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگتے۔ اُس نے جنگلے کے کندھے کے اوپر اپنا سر رکھ دیا اور آہستہ سے جنگلے سے کہا "اے دل کے ہمراز اے دل کے محرم" کیلی کے لوجھ سے جنگلہ یوں ہلا جیسے اس نے کیلی کی بات کا ہنکارا بھرا ہو۔ اور پھر جب کیلی نے جنگلے کے کندھے پر سے سر اُٹھایا وہ بے حس و حرکت ہو گیا جیسے اس نے کیلی کے بھید کو ایک سچے دوست کی طرح اپنے

دل میں سنبھال لیا ہو۔

چلتے چلتے کیلی کے پاؤں رُک گئے۔ چونکہ بائیں طرف کا جنگلہ ختم ہو گیا تھا کیلی نے پیچھے مڑ کر اسٹیشن کی طرف دیکھا کہ وہ پھاٹک سے بہت دُور نکل آئی ہے۔ پچھلی طرف سے اب گاڑی کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ اور ایک منٹ کے بعد چلنے والی تھی۔

کیلی نے پیچھے مڑنے سے پہلے ٹکٹکی باندھ کر اس طرف دیکھا۔ جس طرف گاڑی کو جانا تھا۔ یہ وہی سمت تھی جس سمت میں دیپک گیا تھا اور وہ ایسی ہی ایک گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا۔ بے خیالی میں کیلی کے ہونٹوں سے سرد آہ نکل گئی۔ اب اکثر کیلی سرد آہ بھرا کرتی تھی کئی بار تو اُسے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جب بھی سانس لیتی تھی تو سانس نہیں لیتی تھی بلکہ ایک سرد آہ بھرتی تھی۔ ان آہوں سے کیلی افسردہ نہیں تھی۔ اُسے یوں لگتا تھا کہ وہ کئی برس سے ان آہوں کی منتظر رہی تھی اور اب ایک مدت کے انتظار کے بعد اُسے یہ آہیں ملی تھیں۔ کئی بار بیٹھے بیٹھے کیلی کا دل جھوم اُٹھتا۔ ان آہوں ہی سے تو زندگی فیض یاب ہوتی ہے۔ ،،

دُور جاتی ہوئی ریلوے لائن کو دیکھتے دیکھتے کیلی چونک پڑی۔ لائن پر ایک کالی گٹھڑی کی طرح کچھ پڑا ہوا تھا۔ پیچھے سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز جیسے ساری کی ساری کیلی کے کانوں میں جذب ہو گئی اور کیلی سر سے پاؤں

تک کانپنے لگی۔

کانپتے ہوئے پیروں کے ساتھ کیلی اُس گٹھڑی کی طرف بھاگی۔ اب اُسے گٹھڑی میں سے کسی کی نکلی ہوئی ٹانگیں صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ کیلی دوڑ رہی تھی۔ لیکن اُس کی ٹانگوں کا زور اتنا بھاگنے میں نہیں لگ رہا تھا جتنا کانپنے میں۔ کیلی نے گھبرا کر آتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھا۔ اُسے اور کچھ نہیں، صرف ایک کالا پہاڑ جیسا دکھائی دیا۔ گاڑی کا انجن ایک پربت جتنا اونچا دکھائی دے رہا تھا اور بس ابھی، ابھی اُس کے اوپر گرنے والا تھا۔ کیلی کو بس اتنا پتہ چلا کہ وہ دوڑتی اور ہانپتی ہوئی اُس گٹھڑی کے اوپر گر پڑی اور پھر اس کے کانوں میں گاڑی کی آواز اتنی بھر گئی کہ اُسے کوئی ہوش نہ رہا۔ کیلی کو جب ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ کالا کمبل لپیٹے ایک شخص اُس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اور اُس کے سر اور اُس کی باہوں کو داب رہا تھا۔ کیلی گھبرا کر اُٹھنے لگی مگر اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا بند بند دُکھ رہا ہے اور اُس سے کروٹ تک نہیں بدلی جاتی۔

"گاڑی"، کیلی نے ارد گرد نظر دوڑائی اور سوچنے لگی کہ وہ کہاں پڑی ہوئی ہے۔

"گاڑی گزر چکی ہے"، کمبل اوڑھ کے بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

"تو میں گاڑی کے نیچے نہیں آئی۔؟" کیلی کے منہ سے نکلا۔

کمبل والا شخص زور سے ہنسنے لگا اور اُس نے کہا۔" اگر تو گاڑی کے نیچے آجاتی تو اس وقت باتیں کیوں کر رہی ہوتی ۔؟"

" مگر میں تو لائن کے اوپر گر پڑی تھی اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ گاڑی کا انجن میرے سر کے اوپر چڑھ رہا ہے۔"

" تو مجھے بچانے آئی تھی نا۔؟"

" آئی تو تھی لیکن پھر خبر نہیں کہ کیا ہوا۔"

" تو گھبرا کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ مگر میں ہوش میں تھا۔ تجھے بچانے کے لئے مجھے بھی بچنا پڑا۔ خبر نہیں کہ کہاں سے مجھ میں ہمت آگئی۔ میں نے جب تجھے گھسیٹ کر لائن سے دُور کیا تو گاڑی کی چیخیں میرے سر میں بھر گئیں اور ہم دونوں گھسٹتے گھسٹتے اُس ڈھلان پر سے گر پڑے۔ یہ جو تمہیں چوٹیں لگی ہیں۔ وہ ڈھلان پر سے گرنے کی چوٹیں ہیں۔"

" کیا تم گاڑی کے نیچے آکر مرنا چاہتے تھے؟"

" ہاں ۔ بہن کیلی۔ جینا چاہتا تھا جی نہ سکا۔ مرنا چاہتا تھا مر نہ سکا۔"

کیلی نے چونک کر اُس شخص کی طرف دیکھا اور پھر اُسے پہچانتے ہوئے بولی ۔" کون ۔ بخشا ۔؟"

" ہاں ۔ بہن کیلی ۔ تیری سہیلی نے مجھے جینے نہ دیا اور تو نے مجھے مرنے نہ دیا۔"

" لیکن آج میں نے تو تمہیں مرنے سے نہیں بچایا۔ آج تو مجھے تو نے مرنے سے بچایا ہے،" کیلی کی ہنسی نکل گئی۔

" اصل میں تو تُو نے ہی بچایا ہے اگر تو نہ آتی۔"

کیلی کے جسم پر روڑوں اور کنکروں سے اتنی چوٹ نہیں لگی تھی۔ جتنی گھبراہٹ سے لگی تھی اب جب کہ اُس نے دیکھا کہ گاڑی کے نیچے آکر مرنے والا شخص بچ گیا تھا اور وہ بخشا تھا تو کیلی کے انگ انگ میں ہمت سی آگئی ہو کر لوٹ آئی۔ وہ دھیرے دھیرے اُٹھی۔ پھر اُس نے اپنے کپڑے جھاڑے کہنیوں اور گھٹنوں پر آئی ہوئی خراشیں دیکھیں اور پھر ہنستے ہوئے بخشے سے پوچھنے لگی۔

" تجھے جینے کے لئے متروکا گاؤں ملا اور مرنے کے لئے میرا گاؤں ---؟"

" دونوں ہی غلط ملے،" بخشا ہنس پڑا۔" اس کے گاؤں نے جینے نہ دیا۔ اور تیرے گاؤں نے مرنے نہ دیا،" اور پھر بخشے نے پیروں کی جوتی جھاڑ کر دوبارہ پیروں میں پہنتے ہوئے کہا" خیر نہیں بہن کیلی یہ بھی شاید کرموں کا حساب ہے۔"

" بھیا تم سے ایک بات کہوں ؟"

" کہہ لو۔ جو جی میں آئے کہہ لو۔ میں تو اپنی طرف سے اپنی زندگی کے دن آج ختم کر بیٹھا تھا۔ اب جتنے بھی دن جیوں گا تیرے عطا کئے ہوئے دن جیوں گا۔"

" بخشے۔ میں اور کچھ نہیں کہوں گی۔ بس یہی کہوں گی کہ، اگر تجھے پھر کبھی ایسا خیال آئے تو اتنی سی بات سوچ لینا کہ اس دُنیا میں تیری بہن بھی ہے اور

اُسے تیری ضرورت ہے۔"

"کیلی میں تیرے حکم کا پابند رہوں گا۔"

"بھائی حکم کے نہیں خون کے رشتہ کے پابند ہوتے ہیں۔"

کیلی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے دل ہی دل میں پہلے مترو کو ہزار گالیاں دیں کہ وہ بخشو جیسے نایاب لڑکے کو نہ پہچان سکی اور پھر اُسے مترو پر غصے کی بجائے ترس آیا جو بخشو جیسے نایاب لڑکے سے محروم ہو گئی تھی۔

"پہلے اپنا خط کیلی۔"

"میرا خط؟"

"ماں نے دیا تھا تیرے لئے۔ میں تو اس گاؤں میں تجھے خط دینے کے لئے اُتر پڑا تھا۔ پھر......"

"پھر تجھے یہ کیا سوجھی۔؟"

"کچھ نہیں۔ گاؤں سے اس لئے چلا تھا کہ وہ گاؤں مجھے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ سوچا تھا کہ دُور کسی شہر میں چلا جاؤں گا۔ شاید دل ٹھکانے آ جائے۔ روانہ ہونے وقت تیری ماں کو پتہ چل گیا۔ مجھ سے کہنے لگی۔ جیسے بھی ہو راہ میں کیلی سے ملتے جانا۔ وہ نہ مجھے خط لکھتی ہے اور نہ ہی ملنے آتی ہے اس نے تو جیسے میرے ساتھ سارے رشتے کاٹ دیئے ہیں۔ کیلی۔ تو یوں کیوں کرتی ہے؟؟"

"میں کیا کہتی ہوں بھیّا" کیلی نے ایک لمبا سانس لے کر کہا "ویسے ماں سچ کہتی ہے۔ میرے رشتے سب کے ساتھ کٹ گئے ہیں۔۔"

"تو مجھ سے تو ابھی کہہ رہی تھی کہ بھائی خون کے رشتہ کے پابند ہوتے ہیں۔"

"تیری بات اور ہے بخشے" کیلی نے کھینچ کر ایک سانس لیا اور بولی۔

"یہ دُکھ کے رشتے ہیں۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو میرے درد کو اس قدر پہچانتی ہے۔ میں صبح جب گاڑی سے اُترا تو شش و پنج میں پڑ گیا۔ تجھ سے ملنے اُترا تھا لیکن پھر یوں محسوس ہوا کہ میں تیرے سامنے نہیں آسکتا۔ دو بار تیرے گھر کی طرف چلا لیکن اسٹیشن کی طرف مُڑ آیا۔ تیری صورت کا خیال کروں تو مجھے مترو کا چہرہ یاد آئے۔ اس بات نے اپنے ناخنوں سے میرے زخم چھیل دیئے۔ سوچا تھا کہ چند دن گزرنے پر مترو کو بھول جاؤں گا۔ لیکن آج یوں لگا۔ جیسے میرے دل میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ میں نے سوچا جس دُنیا میں مترو نے دغا کی اُس دُنیا میں رہنا نہیں چاہیئے۔"

"مرنا ہو تو کوئی اُن کے لئے مرے جو دل کے ہمراز ہوں۔ جو دل کو پہچانتے ہی نہیں۔ اُن کے لئے بھلا کیا مرنا۔۔۔۔" کیلی نے ایک بزرگ کی طرح کہا اور بخشے کی ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگا۔

"بہن کیلی، تو سقراط کب سے بن گئی ہے۔؟"

کیلی کو اچانک دیپک کی یاد آئی اور کیلی کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ کیلی نے بات کا رُخ موڑنے کے لئے کہا "تم کون سے شہر جاؤ گے؟"

"کسی بھی شہر چلا جاؤں گا۔"

"اگر کسی بھی شہر یا گاؤں میں رہنا ہے تو اسی گاؤں میں رہ جاؤ۔ تم کبھی کبھار میری خیر و عافیت ہی پوچھتے رہو گے۔"

بخشے نے ذرا حیران ہو کر کیلی کی طرف دیکھا۔

کیلی نے کہا "کبھی بہن بھائی مل بیٹھیں گے۔ دل کی کہا کریں گے۔ دل کی سُنا کریں گے۔"

"بہت اچھا کیلی۔ میں تو کہہ ہی چکا ہوں کہ میں تو تیرے حکم کا پابند ہوں۔"

"حکم کا پابند نہیں۔ خون کے رشتہ کا پابند" کیلی نے پہلے کی طرح پھر بخشے کا جملہ درست کیا اور ساتھ ہی اپنے سر پہ دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے وہ بخشے کو اپنے ہمراہ لے کر گھر کی طرف چل پڑی۔

"کوئی تیری گٹھڑی۔ بقچہ۔" تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد کیلی نے پوچھا۔

"وہ تو میں بھول ہی گیا۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا ٹرنک تھا۔ میں نے دوسری طرف جنگلے کے پاس رکھا تھا تو یہیں کھڑی رہ۔ یا دھیرے دھیرے چل میں دوڑ کر لے آتا ہوں" بخشا تیز تیز قدم رکھتا ہوا پیچھے مُڑ گیا چند منٹوں میں ایک گٹھڑی اور ٹرنک اُٹھائے کیلی سے آملا۔

"کیسی خراب لکڑیاں ہیں۔" کیلی نے جھنجلا کر چولہے میں لگی ہوئی دونوں لکڑیوں پر سے انگارے جھاڑے۔ تڑ تڑ کرتی چنگاریاں اُڑیں اور چولہے پر رکھی ہوئی دال میں آ پڑیں۔ دال کے زرد اُبال میں تین چنگاریاں بجھ کر کالی کنکریاں بن گئیں۔ کیلی نے کڑچھی سے کنکریاں نکالیں اور پھر دال کے پتیلے پر ڈھکن دے دیا۔

چنگاریاں پھر اُڑیں اور اُس دفعہ کیلی کی ٹانگ پر آ پڑیں۔ کیلی نے جلدی سے شلوار جھاڑی لیکن ایک چنگاری بہت موٹی تھی۔ کپڑے کے ساتھ چمٹ گئی اور جب کیلی نے ہاتھ سے اس چنگاری کو جھاڑا تو اُس کے گھٹنے کو آنچ لگ گئی۔ گھٹنے کو ملتے ہوئے کیلی نے دیکھا کہ اُس جگہ شلوار جل گئی تھی۔

پتیلے پر ڈھکن رکھنے سے دال میں زور کا اُبال آیا اور سفید اور زرد پانی دھاریں بن کر چولہے میں گرنے لگا اور آگ میں سے اُٹھتی "سوں سوں" کی آواز سے کیلی کی آنکھ کھل گئی۔ کیلی نے حیران ہو کر دیکھا کہ وہ چوکے میں بیٹھی

والں نہیں نگھار رہی تھی۔ بلکہ وہ تو اپنی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت رات آدھی جا چکی تھی۔

"یہ بھلا کیا سپنا آیا ہے؟" کیلی نے چارپائی پر کروٹ بدلی اور سوچا پھر اُس نے ہاتھ سے گھٹنا ملا۔ جیسے خواب میں آگ کی چنگاری سے اس کے گھٹنے میں اب بھی جلن ہو رہی تھی۔ پھر کیلی کو یوں لگا کہ نزدیک ہی بہت سے آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ کیلی نے کان لگا کر سُنا۔ یہ آواز سچ مچ آ رہی تھی۔ ایک لفظ جو اُسے کئی بار سُنائی دیا وہ تھا "آگ۔ آگ" کیلی چارپائی پر سے اُٹھی۔ اور دوپٹہ اوڑھ کر اُس طرف جانے لگی۔ جس طرف سے لوگوں کی آواز آ رہی تھی۔ یہ آواز شاہ کی بیرونی بیٹھک سے آ رہی تھی۔

جونہی کیلی کمرے سے باہر آئی اُس کی نظر سامنے کا میدان پار کرتی ہوئی میدان کے پرلے سرے پر پڑی۔ وہاں شاہ کا گودام بنا ہوا تھا۔ اُس گودام سے کالا دھواں اُٹھ رہا تھا آگ کے شعلے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن شعلوں کی نسبت دھواں زیادہ بلند تھا۔

لوگ بیٹھک کے اندر نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیٹھک کے دالان میں کھڑے تھے اور کیلی نے دیکھا۔ لکھے شاہ اپنے ایک کارندے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس سے دبی زبان میں باتیں کرتا ہوا اِدھر ہی آ رہا تھا۔ کیلی نے آگے کی طرف بڑھ کر شاہ کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور یہ اندازہ لگانا چاہا

کہ اس نقصان کو برداشت کرنا لکھے شاہ کے لیے کس قدر دشوار تھا۔

"تُو یہاں کیا کر رہی ہے؟" لکھے شاہ کی نظر جب کیلی پہ پڑی تو اُس نے سب سے پہلے یہی کہا۔

"یہ آگ . . . " اور پھر کیلی نے میدان کے اُس پار جلتے ہوئے گودام کی طرف دیکھا۔

"پگلی کہیں کی۔ یہ سالی آگ لگتی ہی رہتی ہے تو اندر جا کے سو جا۔"

لکھے شاہ نے جب اس انداز میں یہ بات کہی تو کیلی نے ایک بار لکھے شاہ کے چہرہ کی طرف دیکھا اور ایک بار گودام میں لگی ہوئی آگ کی طرف۔ پھر وہ پیچھے مُڑ کر کمرے میں بچھی ہوئی اپنی چارپائی کی طرف آتے ہوئے سوچنے لگی۔ خواب میں میرے پہنے ہوئے کپڑے جل رہے تھے اور بیداری میں کپاس کی گانٹھیں یہ کیسی آگ ہے؟ جو میرے سپنے میں بھی لگی اور بیداری میں بھی لگی۔

پھر اپنی چارپائی پر لیٹتے ہوئے کیلی کو خیال آیا۔ "شاہ جس کا کلیجہ صابن کی ٹکیہ کو گھُلتے دیکھ کر خود بھی گھُلنے لگتا ہے اور جو ایک کوڑی کے نقصان پہ بچوں کی چمڑی اُدھیڑ دیتا ہے۔ آج کس کلیجہ کے ساتھ اُس نے یہ نقصان برداشت کر لیا؟

"یہ سالی آگ تو لگتی رہتی ہے" کہہ کر اُس نے بات ہی کھو دی تھی اور پھر کیلی کی آنکھوں کے سامنے شاہ کی آسامیاں آنے لگیں جو سود کی چکی میں پس

رہی تھیں۔ اُس کی منت سماجت کرتے ہوتے اپنے بال بچوّں کا واسطہ دیتی تھیں اور گھنٹوں اُس کی طرف سے کرم کی اُمید میں بیٹھی رہتی تھیں۔ لیکن شاہ کا دل کبھی نہیں پگھلتا تھا۔ وہ چکی کے دستے کو زور سے پکڑ کر انہیں دونوں پاٹوں میں پیستا رہتا تھا۔ آج۔ آج۔ کیلی سوچنے لگی "آج تو کچھ اور ہی بات دکھائی دیتی ہے۔"

کیلی نے ان سب سوچوں کو اپنے کپڑوں پر سے جھاڑ کر سو جانے کی کوشش کی لیکن آج اُس کے دل کی لکڑی میں سے چنگاریاں ہی چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔

"کیا تو ابھی تک سوئی نہیں۔؟" شاہ کی آواز آئی۔

کیلی نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا شاہ کے منہ سے نکلتی ہوئی تھوک کی طرح شاہ کی ہنسی نکل گئی اور اُس نے کیلی کا بازو پکڑ کر کیلی کو چارپائی پر سے اُٹھاتے ہوئے کہا "یہ سالی آگ تو بیمہ والوں کے گھر لگی ہے یہ آگ میرے گودام میں تھوڑی ہی لگی ہے؟" اور شاہ نے کیلی کا بازو کھینچ کر اُسے اپنے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا "بیس ہزار کا بیمہ ہے۔ بیس ہزار کا کتنے کو بیس ہزار ہوتا ہے۔"

"لیکن ایک طرف روپیہ ملا اور ایک طرف مال جل گیا۔ فرق کیا پڑا؟" کیلی نے اپنے بازو کو دوسرے ہاتھ سے یوں مَلا۔ جیسے شاہ کے بازو کھینچنے سے

اس کا بازو مڑ گیا ہو۔

"تو بھی پگلی ہے۔ بالکل پاگل۔ بھلا گودام میں بیس ہزار کا مال ہوتا تو پھر گودام کو سالی آگ کیوں لگتی۔"

"تو پھر یہ آگ۔" کیلی کا منہ جیسے حیرت سے ٹیڑھا ہو گیا۔

"یہ پرماتما جب دینے پہ آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر بھی دے دیتا ہے۔ کیا تو نے یہ بات سنی ہے یا نہیں؟ بس یہی سمجھ لے کہ جیسا چھپر پھٹا ویسی آگ لگی" اور پھر شاہ نے ایک سرور میں آکر کیلی کے تن سے کپڑے اُتارنے شروع کر دیئے "یہ سالی قمیص تو اتنی تنگ کیوں پہننے لگی ہے۔؟"

کیلی پلنگ پر گر پڑی۔ جیسے شاہ نے اُسے دھکا دے کر گودام میں پھینک دیا ہو۔

"آگ لگنے سے پہلے ہی ہم نے بہت سا مال گودام سے نکال لیا تھا۔ اندر تو سالی صرف چار گانٹھیں تھیں کپاس کی اور اس کے اندر کباڑ دھرا تھا۔ تو فکر کیوں کرتی ہے" اور پھر شاہ کے منہ سے رال کی طرح ایک بات ٹپک پڑی۔ "بس سالی صرف ایک دیا سلائی دکھانے کی ضرورت تھی۔" اور جب کیلی کا بدن شاہ کے بدن سے چھُوا تو کیلی کو محسوس ہوا کہ وہ کپاس کی ایک گانٹھ تھی جو آج شاہ کے گودام میں جل رہی تھی۔

کیلی جب شاہ کے بستر سے اُٹھی تو رات ابھی تک باقی تھی۔ کیلی نے کپڑے

پہنتے ہوئے کہا۔" باہر کے دروازے کی کنڈی لگا لو۔ گوردوارے جا رہی ہوں"۔
"گوردوارے ؟"، شاہ نے کہا اور اُسے یوں لگا کہ کیلی واقعی پگلی تھی۔ گودام کو آگ لگا کر بیمہ والوں سے روپیہ لینا وہ پاپ سمجھ رہی تھی اور وہ اس پاپ کے خیال سے اُسے وہم ہو گیا تھا۔ شاہ زور سے ہنسنے ہی لگا تھا کہ ایک وہم اُس کے اپنے دل میں پیدا ہو گیا "کیلی کہتے ہیں کہ یہ بیمہ والے بھی بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ ہر ایک بات کو کُریدتے ہیں۔ بڑا پریشان کرتے ہیں اور پھر کہیں جا کر روپیہ ادا کرتے ہیں۔" شاہ نے سوچا اور اُس کا دل کانپ گیا "بس جب روپیہ گھر آجائے گا اُس وقت اپنا سمجھو۔ کہتے ہیں کوئی انسپکٹر آئے گا"، حلق میں اٹکتی ہوئی آواز سے شاہ نے کیلی سے کہا۔" سنو۔ گوردوارے جا کر کوئی منّت مان آنا۔ یہ روپیہ خیر و عافیت سے گھر آجائے"۔
کیلی نے باہر کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے، نہ پیچھے مُڑ کر دیکھا اور نہ ہی کوئی ہنکارا بھرا۔

میدان کے پرلے سرے پر گودام کی آگ اب مدہم ہو گئی تھی۔ پھر بھی کافی دھواں اُٹھ رہا تھا۔ کیلی نے بس ایک سرسری نظر سے اُس دھوئیں کو صرف اس لئے دیکھا کہ وہ اپنے دل سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی کالک کا اس دھوئیں کی کالک سے موازنہ کر سکے۔

تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے کیلی جب ریلوے لائن کے قریب پہنچی تو پیروں نے یوں آرام کا سانس لیا۔ جیسے وہ لمبی مسافت طے کرنے کے بعد اپنی منزل پر پہنچ گئے ہوں۔ کیلی نے لپک کر ریلوے لائن کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھُوا اور کیلی کو یاد آیا کہ جب اُس کی ماں اُسے انگلی سے لگا کر کسی سنگرات کے دن گوردوارے جایا کرتی تھی تو وہ تھک کر گوردوارے کی دہلیز یوں ہی چھُوا کرتی تھی اور پھر اپنے ہاتھوں کو ماتھے سے لگایا کرتی تھی اور پھر دونوں ہاتھوں سے وہ دہلیز کو دبایا کرتی تھی۔ اس طرح جیسے کوئی سامنے حاضر و ناظر بیٹھا ہو۔ جیسے وہ دہلیز لکڑی کی نہ ہوں۔ بلکہ کسی کے نرم نرم پاؤں ہوں۔ کیلی نے اپنے دونوں ہاتھ ماتھے سے لگائے اور پھر دونوں ہاتھوں

سے لوہے کی اُس لائن کو دبانے لگی۔ کیلی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور وہ سوچنے لگی۔ جب کسی کے دل میں کسی کے لئے احترام پیدا ہوجاتا ہے تو کس طرح ایک ہی جگہ اُس کے لئے زیارت گاہ بن جاتی ہے۔ کیسے کوئی حاضر و ناظر دکھائی دیتا ہے اور کیسے لکڑی یا لوہے کی چیزیں کسی کے نرم نرم پاؤں محسوس ہونے لگتی ہیں۔

بانوری کیلی نے ریلوے لائن پر یوں سر رکھ دیا اور وہیں رہنے دیا۔ جیسے کوئی سجدہ میں جھک جاتے اور پھر اُس کی کچھ ایسی لو لگ جاتے کہ اُسے سر اُٹھانا بھول جائے۔ کیلی کی آنکھوں نے ایک نورِ مجسّم دیکھا اور اُسے محسوس ہوا کہ آج کوئی کرامت ظہور میں آئی ہے۔ ایک پل کے لئے گھرے اندھیروں میں روشنی ہوئی اور پھر وہ روشنی غائب ہوگئی۔ کیلی نے اس پُراسرار روشنی کو کوئی غیبی حادثہ سمجھا اور پھر آنکھیں بند کرکے وہ بے خودی کے عالم میں گم ہوگئی

اور پھر کیلی کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دیوتا اپنے قدموں پر سے اُٹھاکر اُسے اپنے گلے سے لگا رہا تھا۔ "تیری دعا میری درگاہ میں قبول ہوئی مانگ کیا مانگتی ہے۔ مجھ سے؟"

"کیلی۔ کیلی۔ کیا تم ہوش میں نہیں ہو؟" یہ بات بار بار کیلی کے کانوں میں پڑی اور کیلی نے آنکھیں کھول کر گھرے اندھیروں میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دیپک کا چہرہ تھا۔ حاضر و ناظر دیپک کا چہرہ۔

"دیپ۔ سچ مچ دیپ۔"

"ہاں کیلی۔ میں دیپ ہوں۔ سچ مچ دیپ۔ شکر ہے کہ تم ہوش میں آگئیں۔"

"میں ہوش ہی میں تھی دیپ"

"کیا تم مرجانا چاہتی تھیں ۔؟"

"نہیں۔ دیپ میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں جینا چاہتی ہوں۔"

"پھر تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے اپنا سر ریلوے لائن پر رکھا ہوا تھا۔؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے دیپ۔ مگر یہ تو . . . ."

"خاموش کیوں ہوگئیں کیلی مجھے بتاؤ اور سچ سچ بتاؤ۔"

"تم سن کر ہنسو گے دیپ۔"

"میں تو کانپ رہا ہوں کیلی۔ رات کا یہ وقت . . . اور اس وقت ریلوے لائن پر تمہارا سر . . کیا یہ کوئی ہنسی مذاق والی بات ہے مجھے سچ سچ بتاؤ۔"

"دیپ۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے یہ کوئی گوردوارہ ہو۔"

"یہ ریلوے لائن۔؟"

"جیسے گوردوارے کی دہلیز میں ہوں۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو کیلی"۔

"نہیں دیپ۔ جب کوئی اپنے دل میں کسی کی پوجا کرتا ہے تو پھر کوئی بھی جگہ ہو اس کے لئے مندر بن جاتی ہے"

دیپک نے اپنے بدن کے گرد لپٹی ہوئی چادر اُتار دی اور کیلی کے بدن کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا "مجھے سچ سچ بتاؤ کیلی۔ تم اتنی رات گئے یہاں کیسے آئی ہو۔؟"

"میں بہت پریشان تھی۔ میرا دل ٹھکانے نہیں آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں گوردوارے چلی جاؤں۔"

"پھر۔؟"

"پھر یہاں پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ گوردوارہ آگیا۔ میرا دل ٹھکانے پر آگیا۔ میں جُھک کر گوردوارے کے سامنے اپنا ماتھا جُھکا رہی تھی۔"

دیپک نے کیلی کو اپنے باہوؤں میں بھینچا اور کہا "اگر اوپر سے کوئی گاڑی آجاتی تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"اس بات کا مجھے خیال ہی نہیں آیا ۔ ۔ ۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں میرے ساتھ ایک کرامات ہوئی۔ ایک پل کے لئے بہت روشنی ہوئی۔"

"کس وقت؟"

"اس وقت جب میں اپنی آنکھیں بند کر کے تمہاری صورت دیکھ رہی تھی۔"

"پھر ـــــ؟"

"پھر وہ روشنی غائب ہو گئی۔ کرامات یوں ہی ہوا کرتی ہے نا۔؟"

"وہ تو میں نے جیب میں سے دیا سلائی کی ڈبیا نکال کر تمہاری صورت دیکھنے کے لئے ایک دیا سلائی جلائی تھی۔

"تم نے دیا سلائی جلائی تھی۔؟"

"ورنہ میں تمہیں اس اندھیرے میں کیونکر پہچان سکتا۔"

"یہ بھی تو کرامات ہے۔ تم کہاں سے آ گئے ہو اور پھر وہ بھی اس وقت۔"

"میں تو کل شام کا آیا ہوا ہوں۔ مجھے خط لکھ کر ٹھیکیدار نے بلایا تھا۔ بجلی کے کھمبوں اور لوہے کی سلاخوں پر المونیم کا رنگ کرنے کے لئے۔ میں تو اس انتظار میں تھا کب دن نکلتا ہے اور کب تم بچوں کو اسکول چھوڑنے آؤ گی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ابھی کتنی رات باقی ہے۔ میں باہر نکلا۔"

"پھر تو تم کچھ روز یہاں رہو گے۔ کم سے کم تین چار روز۔"

"رہنا تو تھا مگر کیلی۔"

"یہ مگر کیوں؟"

"مگر بات بنی نہیں۔ میں صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔"

"میں سمجھی نہیں۔ کس سے بات نہیں بنی۔ کیا ٹھیکیدار سے۔؟"

"ہاں ٹھیکیدار ہی سے نہیں بنی۔"

"کیا وہ تمہیں پیسے نہیں دے رہا۔؟"

"مجھے تو پیسے پورے دے رہا ہے۔ لیکن جن کا کام کر رہا ہے۔ اُنہیں پورا کام نہیں دے رہا ہے۔"

"تمہیں اس سے کیا واسطہ؟"

"میری اس بات سے صرف اتنا ہی واسطہ ہے کیلی۔ جتنا ایک فن کار کے ہاتھ کا فن سے ہوتا ہے۔ فن ایک پاکیزہ چیز ہوتا ہے اور ایک سچے فن کار سے فن میں ملاوٹ نہیں ہو سکتی۔ . . . . یہ ٹھیکیدار ——ہمارے فن میں اپنے کام سے پُرخلوص رہنے کے لئے آٹھ اصول تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان اصولوں کو، ہم آٹھ لیمپ کہتے ہیں۔ آٹھ روشنیاں۔ان میں ایک لیمپ ہوتا ہے۔ لیمپ آف ٹرتھ۔ سچائی کا چراغ۔ مجھ سے ملاوٹی رنگ میں برش نہیں ڈبویا جاتا۔"

کیلی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرتے ہوئے دیپک کے ہاتھوں پر گر پڑے۔ دیپک نے چونک کر چادر کے پلّو سے کیلی کے آنسو پونچھے اور پوچھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو۔؟"

کیلی نے کوئی جواب دینے کی بجائے دیپک کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے سے ماتھے لگا لیا۔ پھر وہ آہستہ سے کہنے لگی "تم سے آج کی ملاقات کچھ یوں ہے۔

جیسے مجھے گوروکے گھر سے پرساد ملا ہو۔ سچ دیپ۔ سچ یہ پرساد سے کم نہیں۔
چلنا پرساد پاکیزہ ہوتا ہے۔ اتنی ہی تیری یہ بات پاکیزہ ہے۔ اتنی ہی تجھ
سے یہ ملاقات پاکیزہ ہے۔ آج مجھے اس کی سخت ضرورت بھی تھی۔ بہت ہی
ضرورت تھی۔ آج میرا دل بہت ہی افسردہ تھا۔"

"پھر تو میں اپنے دل میں ٹھیکیدار پر جو ناراض ہو رہا تھا۔ کہ اُس نے
خواہ مخواہ میرا کمرا بے خرچ کروا دیا۔ اسے معاف کر سکتا ہوں،" دیپک ہنس پڑا
اور پھر کہنے لگا "ہم جہاں بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں وہاں کوئی حرج تو نہیں؟
رات اب بہت باقی نہیں ہے۔"

"یہاں میرا ایک گاؤں بھائی مختار رہتا ہے۔ لائن کے پار تھوڑے سے
فاصلہ پر اُس کا کمرہ ہے۔ چلو اُس کے پاس چلیں۔ میں کچھ دیر تک تمہارے پاس
بیٹھوں گی۔ آج میں تم سے بہت باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ بہت سی باتیں اور
دیپک کا ہاتھ پکڑ کر کیلی اُٹھ بیٹھی۔ دو تین قدم اُٹھا کر کیلی نے دیپک کے
چہرے کی طرف دیکھا اور سرشار ہو کر کہنے لگی "خدا سچ مچ بہت اچھا ہے
اُس سے کچھ مانگنے کے لئے مجھ میں ہمت نہیں ہوتی۔ مگر آج اُس نے۔" کیلی
کی آواز بھرا گئی اور اُس نے پھر سنبھل کر کہا "اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں
چاہیئے تھا۔ سچ اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیئے تھا۔ بس مجھے اتنا ہی دیکھنا
تھا کہ دُنیا میں کہیں سچ بھی ہوتا ہے۔۔۔"

چلتے چلتے کیلی نے شاہ کے گودام میں آگ لگنے والا قصہ سنانا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ چلتی کیلی جوں جوں شاہ کے گودام میں آگ لگنے کی واردات سُناتی رہی توں توں دیپک کیلی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباتا رہا اور جب کیلی نے بات ختم کی تو دیپک نے رُک کر ایک بار کیلی کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی پیشانی چوم لی "کیلی تم تو خود سراپا سچ ہو۔ تم سچ ڈھونڈنے اور کہاں جاؤ گی۔؟"

سرشار اور سیراب کیلی جب دیپک کا ہاتھ پکڑ کر بخشے کے دروازے کے آگے پہنچی تو رات کی سیاہی کچھ زیادہ باقی نہیں رہی تھی۔ "بخشے دروازہ کھول" کیلی نے آہستہ سے دستک دیتے ہوئے کہا۔

"بہن کیلی۔ تو یہاں اور اس وقت خیریت تو ہے؟" بخشا ہڑبڑا کر اُٹھا اور دروازہ کی کُنڈی کھولتے کھولتے بولتا گیا۔

"دیکھ کیا رہا ہے۔ گوردوارے سے آئی تھی۔ ذرا جلدی چلی آئی" اور کیلی نے اُسی طرح دیپک کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے دہلیز پار کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی طرف کیا دیکھ رہا ہے؟ یہ دیپ ہے۔ گوردوارے کا پرساد۔"

بخشے کو جب دیپک نے یہ بات سنائی کہ کیسے کیلی ریلوے لائن پہ سر رکھ کر پڑی ہوئی تھی۔ تو بخشا کانپ کانپ گیا۔ اُسے وہ دن بار بار یاد آیا۔ جب وہ سیاہ کمبل اوڑھ کر ایک گٹھری کی طرح گچھا مچھا ہو کر لائن پر پڑا ہوا تھا اور کیلی کانپتی ہوئی باہوں سے اُسے گھسیٹتی ہوئی خود وہاں گر پڑی تھی اور کانوں میں جن جیسے سیاہ فام انجن کی چیخیں بھر گئی تھیں۔

" تو یونہی گھبرا رہا ہے بخشے۔ میں وہاں تیری طرح مرنے نہیں گئی تھی۔" کیلی ہنس پڑی۔

" تو کیا وہ جینے کی جگہ ہے۔؟" بخشے کی آنکھوں کے سامنے سے پہاڑ جیسا انجن نہیں ہٹتا تھا۔

"مجھے تو یہ جینے کی جگہ ہی نظر آتی ہے بخشے۔"

"مر کے جینے کی جگہ"

" نہیں بخشے۔ میں ابھی اگلے جنم کی بات نہیں سوچ سکتی۔ میں تو اسی جنم کی بات

کرتی ہوں۔ اسی جنم میں جینے کی بات۔ مجھے تو یہ گاڑی طاقت کا روپ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اُس کی لائن گوردوارے کی دہلیز کی طرح معلوم ہوئی۔ گوروؤں اور پیروں سے بھی تو ہم طاقت حاصل کرتے ہیں۔"

"تو نے تو نروان حاصل کر لیا معلوم ہوتا ہے بہن کیلی۔ مگر مجھے تو یہ ریل گاڑی موت کا روپ نظر آتی ہے۔"

"موت بھی تو طاقت کا روپ ہوتی ہے لیکن مجھے اس کی طاقت ہلاکت آفریں نہیں معلوم ہوتی۔ چونکہ ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُس سے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس زندگی سے زیادہ غارت گر اور کونسی زندگی ہوگی۔ مجھے تو یہ گاڑی یوں لگتی ہے جیسے ہمیں جینے کا راستہ بتا رہی ہو۔ چلتے رہنے کا راستہ آدمی کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ ورنہ جہاں کوئی کھڑا ہے وہیں کھڑا کھڑا باسی ہو جاتا ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے بہن کیلی۔ اگر اس گاؤں میں ہمیں جینا نہیں ملا تو کیا دوسرے گاؤں میں مل جائے گا؟"

"سچ بتا ننھے۔ تو گاؤں سے کیوں بھاگا تھا۔؟"

"وہاں تو میں کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔"

"لیکن یہاں تو تو جی رہا ہے نا؟"

"یہاں تو مجھے میری بہن مل گئی ہے۔"

"کسی کو یہ کیا خبر ہوتی ہے کہ کب کہاں کس کو کوئی مل جائے گا۔"

دیپک، نے لالٹین کی روشنی میں کیلی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کیلی کا چہرہ روشنی کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا۔ دیپک کی آنکھوں میں احترام بھر گیا' اور اس نے آنکھیں جھکا کر کہا "کیلی۔ تم تو خود زندگی ہو۔ زندگی کی حرکت"

بخشے کی پھونکوں سے چولہے میں آگ کا سرخ شعلہ بلند ہوا اور اس نے پتیلے میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا۔ کہ بہن کیلی یوں میرے گھر آئے گی تو میں گھر کا نقشہ ہی کچھ سنوار لیتا" بخشے نے افسردگی سے اپنی کوٹھری کی طرف دیکھا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس کی دیواروں سے سفیدی کی پپڑیاں اتر گئی تھیں۔ دروازے کے کیل سے اس کا پرانا کوٹ لٹکا ہوا تھا اور رات کی جھوٹی تھالی بھی گھڑے کے قریب پڑی تھی۔

"مجھے تو یہ تیری کوٹھری آج بہت حسین معلوم ہو رہی ہے"، کیلی نے ایک بار دیپک کے منہ کی طرف دیکھا اور پھر چارپائی سے اٹھتے ہوتے بولی۔ "بخشے۔ تو بیٹھ جا۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

ٹین کے ایک ڈبے سے بخشے نے کھانڈ نکالی اور کہنے لگا "ایک ہی گلاس ہے۔ پہلے دیپک کو چائے پلا دے۔ پھر خود پی لے۔"

"اور تو پتیلے ہی سے منہ لگا لے گا"، کیلی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں تو آج چلّو ہی سے پی لوں گا۔ بہن کی بنائی ہوئی چائے پھر مجھے کب نصیب ہو گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"، بخشا ایک سرور میں آکر دیپک کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے چارپائی پہ اُس کے قریب آ بیٹھا۔

"تم بہت بیش قیمت انسان ہو۔ بھیّا بخشے"، یہ کہہ کر دیپک نے اپنا ایک بازو بخشے کی کمر میں ڈال دیا۔

"وہ بدنصیب بھی اگر اس انسان کی قدر و قیمت پہچان لیتی"، کیلی نے ہنستے ہنستے بخشے کی طرف دیکھا اور پھر دیپک کو ستّو کی باتیں سُنانے لگی۔

کیلی چائے میں شکر ملا رہی تھی کہ اچانک بخشے کو کوئی بات یاد آگئی اور اُس نے تیزی سے چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی صندوقچی کھولی۔

"یہ تیری سہیلی کی ایک نشانی میرے پاس پڑی ہوئی ہے"، بخشے نے صندوقچی میں سے کانسی کا ایک کٹورا نکالا۔

"وہ ہیر اس کٹوری میں رانجھے کے لئے چوری لائی تھی"، کیلی نے ہنستے ہنستے کہا اور کٹورا دھونے لگی۔

بخشے کی ہنسی بھی کانسی کے کٹورے کی طرح تھی اُوپر سے چمکدار مگر اس

کی تہوں میں اُداسی کی سیاہی رچی ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگا "چوری ہی سمجھ لے۔ ایک دن وہ اس میں میرے لئے کھیر لائی تھی۔"

کیلی نے گلاس میں بھی چائے ڈالی اور کٹورے میں بھی۔ پھر اُس نے گلاس دیپک کو تھما دیا اور کٹورا بخشے کو دیا۔

"گلاس مجھے دے دو اور کٹورا تم لے لو" بخشے نے ہاتھ کا کٹورا دیپک کی طرف بڑھایا۔ پیتل کے گلاس کے سامنے بخشے کو کانسی کا کٹورا زیادہ چمکدار نظر آیا اور اُس نے محسوس کیا کہ یہ کٹورا دیپک کو دینا اس کی خاطر و مدارات کے برابر تھا۔

"جن نگاہوں سے یہ کٹورا تجھے قیمتی معلوم ہوتا ہے وہ نگاہیں صرف تیرے پاس ہیں۔ بھیّا۔" کیلی ہنس پڑی اور کہنے لگی۔

"کھیر تو تُو نے چوری چھپے کھا لی اس میں آج تو میرے سامنے اس میں چائے پی۔ لمحہ بھر کے لئے میں یہ خیال کر لوں گی کہ وہ بدنصیب بھی ہمارے درمیان بیٹھی ہوئی ہے۔"

کیلی تو مترو کی صورت کا تصور کرنے کی بات کہہ کر رات کی پڑی ہوئی جھوٹی کٹوری اپنے لئے مانجھنے لگی لیکن بخشا سچ مچ ہی مترو کی صورت کے تصور میں کھو گیا۔ کٹوری سے چائے کا گرم گھونٹ بھرتے ہوئے کیلی بولی "ہاں سچ۔ شاہ نے مجھ سے آتے ہوئے کہا تھا۔ کہ میں گوردوارے میں کوئی منت مان آؤں تاکہ بیمہ کا روپیہ خیریت سے گھر آ جائے بخشے۔ تو بتا کہ میں کیا منت مانوں؟"

"میں بتاؤں۔" بخشے نے جلدی سے کہا۔

"بتا۔" کیلی نے پوچھا۔

"تو یہ منت مان کہ شاہ کو بیمہ کا روپیہ مل جائے تو وہ کیلی کو گوردوارے کی بھینٹ چڑھا دے گا۔" بخشا ہنسنے لگا۔

کیلی کا منہ چلتے کے گھونٹ کی طرح گرم ہو گیا اور اس نے دیپک کی طرف کچھ ایسی نگاہ سے دیکھا جیسے اس منّت کے لئے اس کی منظوری طلب کر رہی ہو۔

"اس منّت سے پیچھے نہ ہٹنا کیلی۔ شاہ کو روپیہ ضرور مل جائے گا۔" دیپک نے ہنستے ہنستے کہا۔

چھوٹی سی کوٹھری میں یہ ہنسی آسمان کو یوں معلوم ہوتی جیسے ساری دھرتی ہنس رہی ہو اور سوچ رہی کہ نہیں دھرتی کا منہ دیکھنے کے لئے آسمان سے باہر نکل آئی ہوں۔

"میں اب چلتی ہوں بخشتے۔ دن نکل آیا ہے" کیبلی نے ایک بار دروازے سے باہر دیکھا اور کہا۔

"اگر تم کہو تو میں اسٹیشن تک تمہارے ساتھ چلتا ہوں" دیپک چارپائی پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں سوچتی ہوں کہ تم میرے ساتھ نہ جاؤ تو اچھا ہے۔ لوگ الزام لگانے اور بھڑکانے میں بڑی پھرتی دکھاتے ہیں۔"

"کیا تم تھوڑی دیر کے بعد بچوں کو اسکول چھوڑنے آؤ گی؟" "میں وہیں جنگلے کے قریب موجود ہوں گا۔ تمہارا انتظار کرنے کے بعد گاڑی میں سوار ہوں گا۔ دو منٹ ہی سہی۔"

"ہاں سچ بخشتے۔ میں تجھ سے ایک بات کہنا بھول گئی" کیبلی کو کچھ یاد آ گیا اور وہ دیپک کو جواب دینے کی بجائے بخشتے کی طرف منہ کر کے بولی۔ کہتے ہیں کہ فساد برپا ہونے والا ہے۔ شاہ بچوں کو اپنے ننھیال بھیج رہا

ہے۔ میں تو پھر گھر سے باہر نہیں نکل سکوں گی۔ تو ہی دوسرے چوتھے میری خیریت پوچھ جایا کر نا۔"

"میں تجھ سے یہ بات کہنے ہی والا تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں ٹھن گئی ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ اس طرف مسلمانوں کا بہت زور ہے اب تو اندھیرے سویرے باہر نہ نکلا کر۔۔۔" بخشے نے تشویشناک لہجہ میں کہا۔

"مجھے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔"

"یہ بات نہیں کیلی۔ عورتوں کو لوگ زبردستی اٹھا لے جاتے ہیں۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں کہ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تو پہلے ہی زبردستی اٹھا کر لایا گیا ہے۔ میرے ساتھ نئی بات کیا ہوگی۔۔۔" کیلی نے جو سرد آہ بھری وہ دیپک کو یوں معلوم ہوئی کہ کیلی کی چھاتی سے نکلی ہو۔ مگر وہ آہ دیپک کے سینے میں اتر گئی۔

بخشے نے اس موقع کی سنجیدگی کا رخ پلٹنے کے لئے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ تو گوردوارے جانے کے لئے رات کو یوں وقت بے وقت نہ آیا کر نا۔ جب تجھے گوردوارے کی ضرورت ہوگی میں گوردوارہ یہیں لے آیا کروں گا۔"

"اچھا اچھا۔ میں تو اب چلتی ہوں۔ اب تو ہی اکیلا بیٹھ کر پوجا پاٹھ کر لے۔ گوردوارہ تیرے پاس چھوڑ چلی ہوں۔" کیلی نے ہنستے ہوئے ایک بار دونوں

کی طرف دیکھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

دیپک اُٹھ کر کمرے کے . . . دروازے میں کھڑا ہو گیا اور جب تک اُسے کیلی کی پیٹھ دکھائی دیتی رہی وہ دروازے میں کھڑا رہا۔

بخشے نے کس وقت کوٹ پہنا اور کس وقت وہ دیپک کے قریب سے گذر کر باہر گیا اور پھر اپنے ہاتھ میں کانچ کے دو گلاس پکڑے ہوئے کب وہ باہر سے واپس آیا۔ دیپک کو اس بات کا کچھ علم نہ ہوا کیلی جب نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو دیپک نے ایک لمبا سانس لیا اور مڑ کے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ بخشا اُس گھڑی کانچ کے گلاس دھو کر چارپائی پر رکھ رہا تھا۔ اور ایک سرور میں گا رہا تھا۔

پیروں تلے ساری زمین بچھا کر۔

اوپر سے آسمان کی چادر تان لی۔

پھر بخشے نے چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی صندوقچی سے شراب کی بوتل نکالی اور دونوں گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی ڈالتے ہوئے اس نے اگلا شعر پڑھا۔

اے دوست تیری صورت کیا دیکھی

ہم نے خدا کی ذات پہچان لی!

دیپک کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں جس کے باعث اُسے بخشے کا چہرہ دھندلا

دھندلا دکھائی دیا۔ اور پھر دیپک نے ہتھیلی سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا کہ (بخشے کا چہرہ تو پہلے سے بھی زیادہ تاب ناک ہو گیا تھا)

" نہ جانے کس نے یہ شعر لکھے ہوں گے اور نہ جانے کس کی صورت دیکھ کر لکھے ہوں گے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے میرو کا منہ دیکھ کر یا میں نے اب کیلی کا منہ دیکھ کر لکھے ہیں۔"

" میرے دوست ــــ بس یہی سمجھ لو۔ یہ شعر تو سوجھتے ہی اُس وقت ہیں۔"

" یہ شعر کیا تم نے کہے ہیں ۔ ؟"

" کہے کیا ہیں ۔ خود ہی ذہن میں آ گئے ہیں ۔"

بخشے نے شراب کا گلاس جب دیپک کے آگے بڑھایا تو دیپک نے گلاس ہاتھ میں تھام لیا ۔ " تمہارے کہنے پہ آج میں اسے اپنے ہونٹوں سے لگا تے لیتا ہوں ۔ ویسے میں نے کبھی شراب نہیں پی ۔ تم مجھے یہ بتاؤ کیا تم شعر کہا کرتے ہو ۔ ؟"

" مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کو شعر کہتے ہیں ۔ کبھی کبھی یوں ہی تُو تُکیں خود بخود جُڑ جاتی ہیں ۔"

" تو مجھے ایسی ہی اُوٹ تُکیں سنا دے ۔ مجھے شراب جتنا نشہ ہو جائے گا ۔

یہ تو میرے گلاس میں سے اپنے گلاس میں پلٹ دے۔ اس میں صرف ایک گھونٹ رہنے دے۔"

"آج تو ہم ایک دوسرے کے دوست بنیں گے جس طرح لوگ پگڑی بدل بھائی بنتے ہیں۔ تو ایک گھونٹ بھر لے۔ پھر میں تیرا گلاس لے لوں گا۔ ہم گلاس بدل لیں گے۔ ایک گھونٹ میں تیرے لئے اپنے گلاس میں چھوڑ دوں گا۔"

"میں تجھ سے بخشے یہی بات کہنے والا تھا۔ میں نے تجھ میں اپنا دوست پہچان لیا ہے۔"

بخشے نے دیپک کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا اور پھر ایک ہی سانس میں اپنا گلاس اس نے ختم کر دیا۔ صرف ایک گھونٹ اس میں چھوڑ دیا۔ دیپک نے اپنے گلاس میں سے ایک گھونٹ بھرا اور پھر بخشے کے گلاس سے گلاس بدل لیا۔ بخشا جھوم اٹھا اور گانے لگا۔

ساری زمین دیکھی، سارا آسمان دیکھا۔
کوئی درنہ دیکھا تیری بارگاہ جیسا!
ہم نے تیری دہلیز پہ آکر زندگی یوں۔
بھینٹ کر دی جیسے ایک روپیہ!

"جیو بخشے۔ جیو۔ اور میرا یار بھی تم میں زندہ رہے۔

"کیا تم سچ مچ یہ کہہ رہے ہو۔؟"

"میرے اور تیرے جیسے لوگ جب کچھ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہیں۔"

نکھٹو نے اپنے گلاس میں تھوڑی سی اور شراب ڈالی اور کہنے لگا۔ "میرے اور تیرے جیسے لوگ اور کیلی جیسے لوگ۔ مگر مترو جیسے لوگ نہیں۔"

"مترو جیسے لوگ بھی۔ تو نے اُس کی صورت دیکھ کر ہی تو خدا کی ذات پہچانی ہے۔"

"تیری یہ بات بھی سچی ہے۔ میرے دوست"۔ نکھٹو بولا اور گانے لگا۔

ہم نے سات سمندر بلوئے۔
دھرتی کنگال کر رکھ دی، پربت ڈھنک کر رکھ دیئے۔
دُنیا صرف ہاتھ ملتی رہ گئی۔ ۔ ۔ ۔
ہم نے درد کے خزانے لوٹ لئے۔

"واہ میرے دوست واہ۔ درد کے خزانے لوٹنے والے۔"

"درد کا خزانہ لوٹا کرتے ہیں اور محبت کی حفاظت کیا کرتے ہیں۔"

"لاؤ۔ اب دوست والا ہاتھ ملاؤ۔"

اور جب بخشش نے دیپک کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا تو دیپک نے کہا۔
"اس گاؤں میں جہاں کیلی بستی ہے۔ میری محبت کی لاج بستی ہے وہاں
اس لاج کی حفاظت کرنا اور جب بھی کیلی کو میری ضرورت ہو۔ مجھے فوراً
خبر کر دینا۔"

"اگر تو گھبرا نہ جائے تو تجھے ایک خبر سناؤں۔ ساری خبر اچھی نہیں ہے"

شاہ جب لسی پی کر بیرونی بیٹھک کی جانب روانہ ہوا تو اُلٹے پاؤں واپس آکر چوکے میں بیٹھی ہوئی کیلی سے کہنے لگا۔ پہلے تو کیلی نے سوچا کہ شاید بیمہ والوں سے شاہ کو روپیہ نہیں ملا۔ پھر اُسے خود ہی خیال آیا کہ یہ بات نہیں ہو سکتی چونکہ اگر یہ بات ہوتی تو شاہ اپنے پاؤں پہ کھڑا نہ ہوتا کسی چارپائی پہ اوندھے منہ پڑا ہوتا۔ کیلی نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ صرف ایک بار گردن اُٹھا کر شاہ کی طرف دیکھا۔

کارڈ دیکھتے ہی میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ خبر اچھی نہیں ہے یہ دیکھ کارڈ کا ایک کونہ پھٹا ہوا ہے" کہتے شاہ نے واسکٹ کی جیب میں سے ایک کارڈ نکالا کیلی نے ایک سرد آہ بھری جیسے اس کو پتہ چل گیا ہو۔

"تیرا باپ گذر گیا ہے"

کیلی نے اپنا سر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا اور زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

"اب کیا کرنا چاہیئے۔؟" لکھے شاہ نے ذرا سے توقف کے بعد پوچھا۔
کیلی خاموش رہی۔
"تجھے معلوم ہی ہے کہ یہاں سالا کیا معاملہ بنا ہوا ہے۔ کیا خبر وہ بیمہ والے کب آجائیں تفتیش کرنے کے لئے۔ سالے کئی تاویلیں کریں گے۔ مجھے اُن کے سر پر موجود رہنا چاہیئے۔"
کیلی پھر بھی کچھ نہ بولی صرف ایک بار اُس نے اپنے دوپٹہ سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔
"اگر کارڈ بھیجنے کی بجائے تیری ماں کسی آدمی کو بھیج دیتی تو اچھا تھا۔ تو اس کے ساتھ دو راتوں کے لئے چلی جاتی۔ اب میں تیرے ساتھ کسے بھیجوں۔ سالے سب آدمی یہاں شہادتوں کے لئے چاہیئں" اور پھر لکھے شاہ کو ایک بات سوجھ گئی "وہ جو تیرے گاؤں کا ایک بڑھئی لڑکا ہے کیا تیرے ساتھ دو دن کے لئے نہیں چلا جائے گا۔ ویسے تو تجھے "بہن بہن" کہہ کہہ اُس کا مُنہ سُوکھ جاتا ہے میں اس کو سالا کرایہ دے دوں گا۔"
کیلی اُسی طرح گھٹنے پر سر رکھے زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے زمین کی مٹی پر پڑے ہوئے مردہ باپ کی شکل اُسے نظر آ رہی ہو۔
"لڑکے اور لڑکیاں تو ننھیال گئے ہوئے ہیں۔ روٹی مہری پکا دے گی"
یہ بات کہتا ہوا لکھے شاہ بیرونی بیٹھک کی طرف چلا گیا۔

چولہے پر رکھی ہوئی دال کا پانی دھیرے دھیرے سوکھ گیا اور پتیلے کا پیندہ جلنے لگا بالکل اُسی طرح جس طرح انسان کی آنکھوں کا پانی سوکھ جائے تو اُس کا کلیجہ سُلگنے لگتا ہے۔ کیلی نے چونک کر دال کا پتیلا نیچے رکھ دیا۔

کیلی اُوپر کی دال کو کڑچھی سے دوسرے پتیلے میں ڈال رہی تھی کہ بخشے نے بیرونی دہلیز میں کھڑے ہو کر آواز دی "بہن کیلی۔ تو کہاں ہے۔؟" اور پھر پتیلے کی تہہ میں لگی ہوئی دال کی بُو نے اُسے بتا دیا کہ کیلی چوکے میں ہے وہ چوکے میں آ گیا۔

"آ بخشے۔ میں تیری طرف ہی چلی تھی۔ دوپہر کی گاڑی سے میرے ساتھ گاؤں چلنا ہوگا۔"

"باہر شاہ نے مجھے بتا دیا ہے۔"

"دو چار روز لگ جائیں گے۔ اگر کپڑے وغیرہ کی ضرورت ہے تو لے آ۔"

"وہ میں ابھی لے آتا ہوں۔ مگر تو یہ تو بتا کہ تو نے چائے کا گھونٹ بھی پیا ہے کہ نہیں ۔۔۔؟"

"چائے میں پیئے لیتی ہوں۔"

"نہیں تو میرے سامنے پی۔"

"اچھا مونڈھا لے کر بیٹھ جا۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

"دیکھ نا۔ کھائے پیئے بغیر انسان کی گزر نہیں۔" اور پھر بزرگوں کے انداز

یں وہ کہنے لگا: "ایک روز تو جدا ہونا ہی پڑتا ہے۔"

"ہاں بخشئے۔"

"سچ ماننا۔ جب مترو کی ڈولی روانہ ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ اب ساری عمر مجھے بھوک نہیں لگے گی اور میں تین روز تک یوں چارپائی پکڑے رہا، "جیسے میں کوئی زندہ انسان نہ ہوں، چارپائی کا پایہ ہوں۔"

کیلی کو رونے سے ملتی جلتی ہنسی آ گئی اور وہ سوچنے لگی کہ بخشئے بے چارے کو سچ مچ ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا کیونکہ عورتیں ڈولی میں یوں جاتی ہیں۔ جیسے ارتھیاں جا رہی ہوں اور وہ بخشئے کی دھیرج بندھاتے ہوتے بولی "بابو بے چارہ تو اپنے وقت پر گیا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ وہ کتنے برس سے چارپائی پر پڑے ہوئے تھے۔ گنٹھیے سے ان کا بند بند جڑ گیا تھا وہ کوئی جینا تھوڑے ہی تھا۔ وہ تو دن گنا کرتے تھے کہ کب اُن کی گلو خلاصی ہوتی ہے۔" اور پھر کیلی نے ایک لمبا سانس لیا "مگر مترو کی بات اور ہے وہ تو ناگہانی موت تھی۔"

بخشئے کا دل احترام کے جذبات سے لبریز ہو گیا "کیلی اُسے کس قدر سمجھتی تھی۔ کیا کوئی کسی کو یوں بھی سمجھ سکتا ہے۔؟"

گاڑی کی کھڑکی کے ساتھ سر ٹکا کر بیٹھے ہوئے بخشیش نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کیلی کو محسوس ہوا کہ بخشا سو گیا ہے۔ کیلی نے بھی اپنے بدن پر لپیٹی ہوئی گرم چادر کھولی اور پیروں تک اُسے تان کر لیٹ گئی۔

ریل کے ڈبہ میں مسافر زیادہ نہیں تھے۔ دو آدمی پچھلے اسٹیشن پر اُتر گئے تھے۔ ایک آدمی چائے پینے کے لئے اُترا تھا۔ مگر گاڑی چل پڑنے پر بھی وہ ڈبے میں واپس نہیں آیا تھا۔ شاید کسی اور ڈبے میں سوار ہو گیا تھا۔ ایک شخص جو فوجی نظر آ رہا تھا ایک کونے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اور ایک بوڑھا جو ہاتھ میں حقّہ پکڑے ہوئے پچھلے اسٹیشن پر سے سوار ہوا تھا۔ اب بڑے آرام سے بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔

گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ میں ایک تال تھی۔ جو کیلی کے منتشر خیالات کو بھی ایک تال میں باندھ رہی تھی۔ حقّہ کی گڑگڑ بھی کیلی کے کانوں کو بھلی معلوم ہو رہی تھی اور پھر ایک دھیمی آواز کیلی کے کانوں میں پڑنے لگی۔

لاکھ وید اور جادو ٹونے والے بُلوائے۔

کسی پیر فقیر کو بھی نہ چھوڑا۔

مگر اس عشق کے بدبخت پاؤں میں سے۔

ہجر کا کانٹا کسی نے نہ نکالا۔!

یہ شعر ختم ہوتے اور پھر شروع ہو جاتے۔ پھر ختم ہوتے اور پھر شروع ہو جاتے۔ نہ گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ رُکتی تھی نہ حقے کی گڑگڑ اور نہ ہی یہ شعر رُکتے تھے۔ کیلی نے ایک بار اپنے منہ پر سے چادر ہٹا کر بخشے کی طرف دیکھا جس کے بارے میں کیلی کو یہ احساس ہوا تھا کہ وہ سو گیا ہے۔ وہ سویا ہوا نہیں تھا۔ محویت کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ کیلی نے یہ بات سوچی اور چادر دوبارہ تان لی۔

راستے میں ایک اسٹیشن پر ذرا زنگ میں بھنگ پڑا۔ لیکن جونہی گاڑی کے قدموں میں حرکت آئی پہلے جیسی محفل گرم ہوگئی۔ صرف ایک مسافر اور اس محفل میں شریک ہو گیا تھا۔ بخشے کے شعر تبدیل ہو گئے۔ اب وہ اور بھی دھیمے مگر بڑے گہرے سُروں میں گا رہا تھا۔

اے دوست۔ تیری بارگاہ پر۔

لمبی مسافت طے کر کے پھر آئے۔

فقیروں سے کاہے کی ناراضگی

اُٹھ کمز ہمیں دیدار دے!

اگلے اسٹیشن پر جب وہ تمام آوازیں تھم گئیں تو فوجی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار ایک طرف رکھ دیا اور اُتر کر دو کلہڑوں میں چائے لے آیا۔

"نوجوان۔ تم بہت اچھا گاتے ہو۔" فوجی نے بخشے کے پاس بیٹھ کر چائے کا ایک کُلہڑ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کا شکریہ۔ آپ چائے پیجیے۔"

"ایک دو گھونٹ پی لو۔ دیکھو۔ میں اپنے لئے بھی تو لایا ہوں۔"

بخشا چائے لوٹا رہا تھا جب اُسے کیلی یاد آ گئی۔ وہ پشیمان ہوا کہ اُس نے کسی بھی اسٹیشن پر کیلی کو چائے پانی وغیرہ کے لئے نہیں پوچھا تھا۔

"میری بہن بھی میرے ساتھ ہے" بخشے نے کہا اور کھڑکی میں سے چائے والے کو آواز دی اور چائے کا ایک اور کُلہڑ پکڑ لیا۔

گاڑی کے پہلے جھٹکے پر ساتھ بیٹھے ہوئے بوڑھے نے حقہ کی آنچ جھاڑی اور ایک لمبا کش لیتے ہوئے بولا "نوجوان۔ تو نے یہ شاعری کا روگ کہاں سے لگا لیا۔ ابھی تو تیری کھانے اور ہنسنے کی عمر ہے۔"

فوجی کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ بوڑھے کی طرف منہ کر کے بولا "بتاؤ! تم تو بڑے زندہ دل انسان معلوم ہوتے ہو۔ آجاؤ پھر ادھر۔ حقہ بھی لے آؤ۔ ٹھہرو لاؤ میں تمہارا حقہ اُٹھا لیتا ہوں" اور فوجی نے بڑے تپاک سے اُٹھ

کہ بوڑھے کا حقہ اُٹھا لیا۔

"تم لڑکے بالے کیا کمائی کرو گے۔ آج لگائی۔ کل بجھائی۔" بوڑھے نے کہا اور فوجی کے ہاتھ میں حقہ پکڑانے پر کوئی اعتراض نہ کیا اور پھر وہ اُس کے پیچھے پیچھے بختے والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ "نوجوان۔ تم نے ضرور ہیرے کی پرکھ جانی ہوئی ہے۔ یہ بات تو میں تمہاری آواز ہی سے پہچان گیا تھا،" بوڑھے نے بختے سے مخاطب ہو کر کہا۔

بختا ہنس پڑا لیکن بوڑھا یہ بھی پہچان گیا کہ بختے کی ہنسی میں غم کی آمیزش تھی۔ بوڑھا کچھ کہنے لگا تھا کہ فوجی بولا "تاؤ۔ یہ پرکھ بھی تو اُس میں پیدا ہوتی ہے جس نے خود ہیرا چاٹا ہو۔"

"ہاں بھتیجے۔ یہ پرکھ بھی اُسی میں پیدا ہوتی ہے۔" بوڑھے نے ذرا تن کے فوجی کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر کہا "اور مجھ جیسے وردی والوں میں پیدا ہوتی ہے؟"

"بابا۔ تم تو میری صورت دیکھ کر ہی ناراض ہو گئے ہو،" فوجی نے ذرا جھنجلا کر کہا۔

بوڑھا ہنس دیا اور بولا "دیکھا ابھی تم مجھے تاؤ کہہ رہے تھے اور اب میں بابا بن گیا ہوں۔ تم لوگوں کو وردیوں سے محبت ہوتی ہے یعنی تمغوں سے تمہیں انسانوں سے پیار نہیں ہوتا۔"

فوجی کے بجھے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر بختے نے بڑے انکسار سے کہا "باباجی! سچ بتانا کسی دردی نے ایسا معلوم ہوتا ہے تمہیں رنج پہنچایا ہے!"

بوڑھے کے سفید چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور اس نے دوسری طرف منہ پھیر کر حقے کا کش لگایا۔ فوجی کے بجھے ہوئے چہرے پر پھر رونق آگئی اور وہ آگے بڑھ کر بوڑھے کے گھٹنے دباتے ہوئے بولا "ناراض کیوں ہوتے ہو تایہ لو میں اپنا فوجی کوٹ اتار دیتا ہوں۔ اندر سے میں بھی ویسے ہی دل کا انسان ہوں جیسے تم۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ دائیں ہاتھ سے فوجی کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے بولا "میں خواہ مخواہ تم سے رنجیدہ ہو گیا۔ پھوڑے میں درد ہونے لگتا ہے نا۔" اس کے بعد بوڑھے کی آواز بھرا گئی اور اس سے بولا نہ گیا۔

بختے کے لئے اب اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا کہ وہ بات کا رخ بدل دے اور اس نے پھوڑوں پر لگانے والا وہی مرہم استعمال کیا جسے وہ پہلے استعمال کر چکا تھا وہ گانے لگا۔

ہم نے اپنے ہاتھ میں دل کا چھاج پکڑ کر
زمانے کے اناج کی چھان پھٹک کی ہے!
اے دوست ہمارے دل کا حال نہ پوچھ
ہم نے عشق کا ہیرا چاٹا ہے!

اپنی طرف سے تو بخشے نے مرہم استعمال کی تھی لیکن بوڑھے کے دل کا پھوڑا اور بھی رسنے لگا اور اس کی بوڑھی آنکھوں میں سے جوان آنسو ٹپکنے لگے۔

عباس پور کا اسٹیشن آگیا۔ بخشے اور کیلی کو یہیں اُترنا تھا۔ بخشے نے بڑے احترام سے بوڑھے کے پاؤں چھوئے اور پھر کیلی کے ہمراہ گاڑی سے اُتر گیا۔

اسٹیشن سے باہر آتے ہی کیلی نے بخشے سے وہ بات کہی جو راستہ بھر وہ سوچتی رہی تھی "بخشے۔ میں نے تجھے اپنے ساتھ لا کر اچھا نہیں کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس گاؤں کے ناخن تیرے زخموں کو بُری طرح چھیل دیں گے۔"

"نہیں کیلی۔ اپنے ہی ہاتھوں کے ناخن زخم چھیلتے ہیں۔ بیگانے ناخن کب کسی کا زخم چھیلتے ہیں۔ تو کوئی غم نہ کر۔" بخشے نے جواب دیا اور باہر آکر تانگے میں بیٹھتے ہوئے بولا "مجھے تو یہ آج والا بوڑھا نہیں بھول رہا۔ لوگ نہ جانے اپنے دلوں میں زخم بھر کے کہاں کہاں گھومتے رہتے ہیں۔"

ماں بیٹی جب ایک دوسرے کے گلے سے لگ چکیں تو شام کافی گہری ہو چکی تھی۔ پڑوسنوں اور رشتہ دار عورتوں کو ایک عورت نے اشارہ سے اُٹھایا اور پھر اپنے گھر جاکر ایک چھبے میں کچھ روٹیاں اور کٹورے میں سالن بھر کے لے آئی اور بولی "بس کر کیلی کی ماں۔ لڑکی تھکی ہوئی آئی ہے اور پھر صبح کی بھوکی ہوگی۔ ایک دو نوالے کھا کر اسے سونے دے۔"

کیلی نے ہاتھ منہ دھویا۔ ماں نے تھالی میں روٹی ڈال کر دی اور پھر روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے ماں سے پوچھنے لگی "کیا بالو نے مجھے یاد کیا تھا؟"

"کیلی۔ خبر نہیں کیوں۔ آخری دنوں میں اُسے ایک وہم سا ہو گیا تھا" ماں نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "سارا دن کچھ نہیں بولتا تھا لیکن جونہی سورج ڈوب جاتا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتا تھا کہا کرتا تھا میں نے بہت ظلم کیا ہے۔ میری اکلوتی بیٹی تھی۔ اُس پہ بھی میں نے ستم توڑا۔"

"کیا ___؟" کیلی کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا۔

"کیوں کیلی، تو خوش نہیں ہے نا۔۔؟"

"یہ بات رہنے دے ماں مجھے یہ بتا کہ باپو کیا کہا کرتا تھا۔؟"

"کہتا تھا۔ جب باہر اندھیرا ہو جاتا ہے میری روح میں اُجالا ہو جاتا ہے اور میں اُس اُجالے میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری بیٹی زار و قطار روتے چلی جا رہی ہے۔ روتے چلی جا رہی ہے۔ میں جب بھی اُس کی صورت دیکھتا ہوں۔ مجھے اُس کی روتی ہوئی صورت نظر آتی ہے۔"

کیلی نے پانی کا گھونٹ بھر کر حلق کا نوالہ نیچے کیا اور پوچھنے لگی "تو پھر باپو نے مجھے بُلوا کیوں نہ بھیجا۔؟"

"کہتا تھا لوگ اپنی اولاد کو زمین دیتے ہیں۔ مکان دیتے ہیں کنواں دیتے ہیں۔ میرا تو اس بیماری نے کچھ نہیں چھوڑا۔ میں نے اُسے کچھ نہ دیا میرے پاس اُسے دینے کے لئے تھا ہی کیا۔ میرے پاس تو بس گنٹھیے کی بیماری تھی۔ وہ میں نے اپنی بیٹی کو دے دی۔"

"گنٹھیے کی بیماری ؟"

"خبر نہیں تیرے باپو کو کیا ہو گیا تھا۔ عجیب و غریب باتیں کیا کرتا تھا کہا کرتا تھا۔ یہ جو شادی ہوتی ہے نا۔ زبردستی کا بیاہ۔ یہ بھی گنٹھیے کی بیماری ہوتا ہے۔ انگ اور گھٹنے مفلوج ہو جاتے ہیں اور انسان کا دل مفلوج ہو جاتا ہے۔"

کیلی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور سامنے پڑی ہوئی سالن

کی کٹوری میں جذب ہو گئے۔

"بس ایک ہی بات اُس کے سر پر سوار ہو گئی تھی۔ کہا کرتا۔ لوگ مجھے پریشان کیا کرتے تھے کہ تیرے دم کا بھروسہ نہیں تو اپنے سر سے بیٹی کا بوجھ اُتار دے۔ اپنے سر سے سارا بوجھ اُتار دیا اور سارا بوجھ بیٹی کے سر کے اوپر رکھ دیا۔ ہائے میری بیٹی کتنی نازک تھی۔؟"

"کیا کسی نے میرے بارے میں باپو سے کچھ کہہ دیا تھا۔؟" کیلی نے دوپٹے کے پلّو سے اپنا منہ پونچھا اور پھر ماں سے پوچھا۔

"کہا تو کچھ نہیں تھا۔ کوئی کیا کہتا۔" ماں کافی دیر تک کیلی کے منہ کی طرف دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ "وہ تیری سہیلی تھی نا ستو"

"ہاں۔"

"وہ بیمار رہتی ہے۔"

"کیوں کیا ہوا ہے اُسے؟"

"کہتے ہیں اُس پر کسی کا سایہ پڑ گیا ہے۔"

"سایہ۔؟"

"خدا کی خدا ہی جانے۔ وہ کسی سے نہیں بولتی۔ دن بھر پتھر کی طرح پڑی رہتی ہے۔"

"کیا تو نے اُسے دیکھا ہے ماں۔؟"

"سو بار دیکھا ہے۔"

"وہ تو اپنے سسرال میں ہو گی۔؟"

"رہتے بھی وسے سسرال میں کہاں۔ یہیں ماں کے پاس ہی ہے۔ وہ اُسے کبھی سے بھی جاتے ہیں۔ لیکن وہاں تو اس کا اور بھی بڑا حال ہو جاتا ہے۔ اب تو وہ کسی کو پہچان بھی نہیں سکتی۔ اب تو وہ خود بھی ایک سایہ بن کر رہ گئی ہے۔ کتنی ہنس مکھ ہوا کرتی تھی۔"

"مگر تو متو کی بات تو نہیں کر رہی تھی ماں۔ میں نے تو پوچھا تھا کہ باپو سے میرے بارے میں کسی نے کچھ کہا تو نہیں تھا؟ یہ متو کی بات بیچ میں کہاں سے آ گئی؟"

"وہی بات تو میں بتا رہی تھی۔ میں نے خود تو کانوں سے سُنا نہیں لیکن مجھے شک ہوتا ہے کہ متو کبھی کبھی تیرے باپو کے پاس آ کر بیٹھ جایا کرتی تھی اور جس دن متو آیا کرتی تھی۔ اس شام کو تیرا باپو کچھ زیادہ ہی بولا کرتا تھا۔"

"ہونہہ۔"

"تو نے کیا متو سے کچھ کہا تھا۔؟"

"میں نے۔ میں بھلا متو سے ملی ہی کہاں تھی۔؟"

"ملی تو نہیں۔ میں نے سوچا شاید تم نے اُسے کوئی خط لکھا ہو۔"

"نہیں۔ میں نے تو اُسے کبھی خط بھی نہیں لکھا۔"

"پھر نہ جانے کون تیرے باپو کے کان بھرتا تھا؟ شاید اُس کے اندر سے

کچھ آواز اُٹھتی تھی۔ اُسے وہم ہوگیا تھا۔''

کیلی ٹکٹکی باندھ کر ماں کے منہ کی طرف دیکھنے لگی اور سوچتی رہی ''لوگ کہتے ہیں کہ ماؤں کو اپنی بیٹیوں کے دُکھ کا علم ہوتا ہے۔ مگر شاید میرے باپو کے سینے میں ماں کا دل تھا۔''

''مرنے سے دو دن پہلے تیرے باپو نے ایک پنڈت کو بُلایا تھا۔''

''پنڈت کو۔۔؟''

''اُس سے کہنے لگا کہ میری بیٹی کی جنم پتری بنا دے اور مجھے بتا۔ کہ اس کی قسمت میں سُکھ ہے یا نہیں میرے منہ سے نکل گیا کہ بھلا کوئی بیٹیوں کی جنم پتری بھی بنواتا ہے۔ بس پھر کیا تھا وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ عمر بھر کبھی مجھ سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ خبر نہیں۔ آخری دنوں میں اُسے کیا ہوگیا تھا اُس کا سبھاؤ بہت ہی کڑوا ہوگیا تھا۔''

کیلی کا گلا بھر آیا اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی غرض سے سامنے پڑے ہوئے برتنوں کو باہر کے حوض پر رکھنے چلی گئی۔ پھر اُس نے ماں کی چارپائی بچھائی اپنی چارپائی بچھائی اور باہر کی کنڈی لگا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ کیلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے بستر پر لیٹے لیکن ماں نے اُسے بتایا کہ اُس کے باپو کا بستر اُس نے دان میں دے دیا تھا۔ کیلی نے اپنی چارپائی گھسیٹ کر اُس جگہ پر کر لی جہاں پچھلے کئی برس سے اُس کا باپو چارپائی پر پڑا رہا تھا اور پھر کیلی کی

آنکھوں کے سامنے یہ منظر آیا۔ کہ کس طرح اس جگہ اُس کا باپو مترو کو پاس بٹھا کر اُس سے کرید کرید کر اپنی بیٹی کے بارے میں باتیں پوچھا کرتا تھا۔

"مگر مترو پہ کیا گزری؟" کیلی نے پاس چارپائی پر پڑی ہوئی ماں سے پوچھا۔

"یہ تو خدا ہی جانے۔ اچھی بھلی ہنستی کھلتی کا بیاہ ہوا۔ دو بار سسرال گئی اور یہ حال ہو گیا۔ جیسے کوئی لیموں نچوڑ دے۔ ہاتھی دانت کا چوڑا اُس کی باہوں میں پھنس کر آیا تھا اب تو خود ہی اُتر جاتا ہے۔"

"کسی حکیم کو دکھایا ہو گا۔؟"

"بھلا۔ کیا ایک حکیم کو دکھایا ہے۔ جہاں کہیں سیانے کی اطلاع ملتی ہے۔ اُس کی ماں وہیں دوڑی جاتی ہے۔ اُس پہ تو کوئی دوا اثر ہی نہیں کرتی۔ ساتھ کے گاؤں میں کوئی سادھو آیا ہوا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ بڑا ہی پہنچا ہوا سادھو ہے۔ بس ایک ہی چٹکی دیتا ہے اور مریض کا روگ جڑ بنیاد سے جاتا رہتا ہے۔ لیکن مترو پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ ماں گنڈا تعویذ بھی لائی۔ مگر کچھ نہ بنا۔ شمشان کے باوا سے بھی ٹونا کروایا۔ سیانے کو بھی بلوایا۔ خدا کی خدا ہی جانے۔"

"مترو کیا کہتی ہے۔؟"

"وہ تو نرا پتھر بن گئی ہے۔ منہ سے کچھ کہتی ہی نہیں ہے۔"

"مگر تُو تو کہتی ہے کہ وہ باپو کی خیریت پوچھنے آیا کرتی تھی اور باپو سے باتیں بھی کیا کرتی تھی؟"

"نہ جانے تیرے باپ کے ساتھ اس کی کونسی رگ ملتی تھی مگر یہ تو بہت دنوں کی بات ہے۔ اُس وقت تو وہ تھوڑا بہت پہچانتی بھی تھی۔ مگر اب تو . . .
ماں زبردستی چند لوئے اُسے کھلا دیتی ہے۔ ورنہ ہزار نعمتیں اُس کے پاس پڑی رہیں۔ کیا مجال جو وہ ہاتھ بھی لگا جائے۔" ماں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا "قسمت کی بات ہے۔ خدا نے کیا نہیں دیا ہوا۔ ایک طرف تو لوگ ایک وقت کی روٹی کو ترستے ہیں اور دوسری طرف ہزاروں چیزیں یوں ہی بیکار چلی جاتی ہیں۔ نہ اُسے کھانے کی پروا نہ پہننے کی جیسے اُس کی قسمت میں یہ سب کچھ تھا ہی نہیں۔"

"مگر کبھی تو کچھ کہتی ہو گی۔؟"

"تجھے بتایا تو ہے کہ وہ کچھ نہیں بولتی۔ اب تو اس کے گھر لوگ اس کی آواز کو بھی بھول گئے ہیں۔ سوتے میں کبھی بڑبڑاتی ہے۔ مگر وہ بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہی کچھ کہتی ہے۔ برادہ بہت گیلا ہے۔ میں اُسے جلا نہیں سکتی۔"

"برادہ۔" کیلی نے چونک کر رضائی ایک طرف پھینک دی۔ اور چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیوں کیا بات ہے؟" ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" کیلی نے دھیمی آواز میں کہا اور پھر چارپائی پر لیٹ کر رضائی کندھوں تک اوڑھ لی۔

کل کیلی کو اس کے گھر پہنچا کہ بخشنا وہاں سے جلدی اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ جب تک بیٹی کو گلے سے لگا کر ماں اپنے دل کا غبار نہیں نکال لے گی تب تک اُس کا جی ہلکا نہیں ہوگا۔ اس لئے اُسے اپنا وہاں بیٹھنا بیکار نظر آیا تھا۔ آج صبح ہوتے ہی بخشا ماں کے پاس دم بھر بیٹھنے کے لئے آگیا۔

" بیٹا تو نے بہت تکلیف کی میرے لئے،" ماں نے بخشے کے بیٹھنے کے لئے موندھا بچھا دیا۔ بخشا شہر میں کوئی کام بنا۔؟" ماں نے یہ پوچھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا۔

" یہ تو نے اچھا کیا کہ کیلی کے قریب ہی تو رہنے لگا ہے۔ تو کبھی کبھی بہن کی خیریت بھی پوچھ لیا کرے گا۔"

" اب تو ماں۔ ہم تجھے بھی وہیں لے جائیں گے تجھے یہاں اکیلی نہیں چھوڑیں گے۔"

" میں کیا یہاں اکیلی ہوں؟ سارا گاؤں آباد ہے۔ اپنے رشتہ دار اور سمبندھی اپنا گھر .... اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ رشتہ دار اگرچہ مرد کے ہوتے ہی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ مرد زندہ نہ رہے تو پھر کیسے رشتہ دار اور گھر بیٹیوں سے بستے ہیں۔"

اصل میں جب کیلی کا باپ انتقال کر گیا تب صرف کیلی کی ماں ہی نہیں بلکہ سارے گاؤں کی عورتیں روتی تھیں۔ تو وہ اتنا کیلی کے باپ کے لئے نہیں روتی تھیں جتنا کہ کیلی

کے اُس بھائی کے لئے جو بیس برس ہوئے زچگی کے ایام ہی میں چل بسا تھا۔

"ابھی تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیسے رشتہ دار اور کیسا گھر۔ وہاں رہو گی تو کیلی کی صورت تو دیکھ لیا کرو گی۔"

"مگر بختے تو بھی تو ان ہونی بات کہہ رہا ہے۔ بھلا میں بیٹی کے دروازے پر جا بیٹھوں گی۔؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے ماں میں نے تو یہ کہا ہے کہ۔۔" بختے کے دل میں ایک مدت سے یہ بات گھر کر چکی تھی۔ کہ اُس کے اندر لوگوں سے محبت کرنے کا جنون ہے مگر لوگوں کو اس جنون کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کئی بار وہ کوئی بات کہتا کہتا بیچ ہی میں رُک جایا کرتا تھا اور مُنہ پھیر کر دوسری طرف چل پڑتا تھا۔ اب بھی یونہی ہوا۔ بختے کی بات ادھوری رہ گئی۔

اور پھر بختے نے کیلی کے چہرے کی طرف دیکھا اور اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کیلی کی آنکھوں میں اس جنون کی قدر تھی۔ اس لئے بختے نے نگاہیں جھکا کر اپنی بات پوری کر دی۔ "پورن سولہ برس کے بعد آ کر اپنی ماں سے ملا تھا تو یہ سمجھ لینا کہ بختا تجھ سے بیس برس کے بعد آ کر ملا ہے۔ مر جانے اور بچھڑ جانے والے برابر ہوا کرتے ہیں۔" اور بختے کا چہرہ اس جذباتیت سے سرخ ہو گیا۔

کیلی نے جن نگاہوں سے بختے کی طرف دیکھا اگر اُس کا سر اُونچا ہوتا اور وہ کیلی کی نگاہوں کی طرف دیکھ لیتا تو اُسے پتہ چل جاتا کہ اُس دُنیا نے آج کیلی

کی آنکھوں میں بیٹھ کر اُس کے جنون کی ساری قیمت ادا کر دی ہے۔

"میں قربان" ماں نے کہا اور اُس کا گلا بھر آیا۔ ماں کے یہ الفاظ سُن کر کیلی کو بخشے سے بھی زیادہ حیرانی ہوئی کہ کیسے بیٹے کے ایک لفظ پر بوڑھی کو کھد بھی جوان ہو سکتی ہے۔

چاہتے بنلتے اور بخشے کو چلتے پلاتے ہوئے کیلی کا یہی جی چاہ رہا تھا۔ کہ کسی طرح ماں کے منہ سے مترو کی بات چل نکلے۔ رات کو کیلی نے جو کچھ ماں کے مُنہ سے سُنا تھا۔ اُس سے اُس کی آنکھوں میں مترو کچھ اور ہی ہو گئی تھی مگر وہ کیلی کی نگاہوں میں پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی اور کیلی کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح بخشا بھی مترو کی یہ صورت دیکھ لے۔ لیکن مترو کی کوئی بات نہ ہوئی۔ ماں بخشے سے اپنے کھیتوں کو بٹائی پر دینے کی بات کرتی رہی۔

"دفعتاً باہر کا دروازہ کھُلا اور آواز آئی "بیٹا کیلی تو آ گئی ہے۔۔؟"

"کیا تم ہو موسی۔" کیلی نے مترو کی ماں کی آواز پہچان کر کہا۔ "شام ہی کو آئی تھی موسی۔"

اس کے بعد مترو کی ماں کیلی کو گلے سے لگا کر اور اُس کے باپو کی باتیں کرتی ہوئی رونے لگی۔ یوں تو اور بہت سی عورتیں کل کیلی سے مل کر روئی تھیں۔ مگر کیلی کو یوں محسوس ہوا کہ اس عورت کا دل بہت ہی نرم پڑ گیا تھا۔ کیلی کا دل بھی ہمک کر اس کی آغوش میں جا پڑا۔ اس رونے میں ایک نہیں دو ٹوٹے ملے

ہوئے تھے۔ کیلی کو محسوس ہوا کہ جس مترو کی صورت اُس نے بھلا دی تھی اس وقت اُسی صورت کو دیکھنے کے لئے وہ تڑپ رہی تھی۔

پھر کیلی نے دیکھا کہ بختا پتہ نہیں کب اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ "بدنصیب جس کا نام سُننے کے لئے وہ ترس رہا ہے اس کا نام سننے سے ڈرتا ہوا چلا گیا،" کیلی نے دل ہی دل میں کہا اور پھر مترو کی ماں کو بٹھاتے ہوئے بولی "سچ بتا۔ موسی مترو کو کیا ہوا ہے؟ کل رات مجھے ماں نے کچھ بتایا تھا؟"

جس طرح زخم پر بندھی ہوئی پٹی چاہے کوئی طبیب ہی کھولنے لگے ایک بار تو مریض کا دل ہل جاتا ہے اسی طرح مترو کی ماں نے سسکی بھینچی اور پھر درد کے مارے آنکھیں سکیڑ کر کہنے لگی "اُسے تو نہ جانے کیا روگ لگ گیا ہے۔"

"لیکن موسی۔۔۔" کیلی کی بات بیچ ہی میں کٹ گئی۔ مترو کی ماں بیچ میں بول پڑی۔ "تیری ماں ابھی چالیسواں نہیں نہائی تھی۔ جب میرے ہاں مترو پیدا ہوئی تھی۔ تم دونوں شروع ہی سے ایسی تھیں جیسے جڑواں بہنیں ہوں یعنی اگر ایک نے اوپر کا دانت نکالا تو دوسری نے نیچے کا دانت نکال لیا۔ اگر آج ایک کی آنکھیں دُکھنے آئیں تو کل دوسری کی دُکھنے لگیں۔ تم دونوں کو تو کھانسی بھی ایک ساتھ لگی تھی۔ بہت بڑی کالی کھانسی۔ ہمیں تو تم نے دن کو تارے دکھا دیئے تم روتی بھی ایک ساتھ تھیں اور ہنستی بھی ایک ساتھ۔ لوگ جلتے تھے کہ بھلا اتنا بھی کیا لگاؤ ہوا۔ ایک جاٹوں کی لڑکی اور ایک کشتریوں کی کیسی پاپی نے

ان فاختاؤں کی جوڑی کو نظر لگادی۔"

"اس طرح کیوں کہتی ہو موسی۔" کیلی نے جلدی سے کہا "منترو اچھی ہو جائے گی۔ تو اُس کی خیریت مانگ۔"

"تیرے منہ میں گھی شکر بیٹی۔" منترو کی ماں نے بلکتے ہوئے کہا "کاش میں ایک بار پھر تم دونوں کو اُسی طرح ہنستے ہوئے دیکھوں۔"

"جو منت مان سکتی ہو۔ مان لو۔ میری بہن اچھی ہو جائے گی" کیلی نے اپنی آنکھیں پونچھ کر ہنسنے کی کوشش کی۔

"تو جو مانگے کیلی؟" منترو کی ماں نے کیلی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی گوروا ور پیر کی درگاہ کی طرف دیکھتا ہے۔

"تو پھر زبان کی پکی رہنا موسی۔" کیلی کے جی میں جانے کیا آیا کہ اُس کے مُنہ سے یہ بات نکل گئی۔ ویسے کیلی خود بھی سوچ رہی تھی کہ وہ کون سی انہونی کو ہونی بنالے گی۔

"میں تجھ پہ قربان جاؤں۔ تو ایک بار اپنی زبان سے کچھ کہہ تو سہی۔"

"ابھی تو میں کچھ نہیں مانگوں گی۔ ہاں جو منترو اچھی ہو گئی تو پھر میری اور تیری باتیں ہوں گی۔"

"اچھا بیٹی۔ یوں ہی سہی۔" منترو کی ماں نے ایک بار فرطِ مسرت سے کہا لیکن فوراً ہی اُمید کا تانا بانا بننے والا حوصلہ ٹوٹ گیا اور وہ مایوس سی ہو کر کہنے لگی

"تو اُسے آکر ایک بار دیکھ تو سہی۔ پتھر کی طرح پڑی ہوتی ہے۔"

"چل اُٹھ مجھے اُس کے پاس لے چل۔" کیلی نے کہا اور اُس کا بازو پکڑ کر اُسے اُٹھایا۔

راستہ میں مترو کی ماں کیلی کو ان سب جتنوں اور کوششوں کا حال سناتی رہی۔ جو اُس نے اپنی بیٹی کو صحت یاب بنانے کے لئے کی تھیں۔ اُس نے ایک نیا جتن بھی بتایا۔ "کہتے ہیں پہلے مترو کے خاوند کا رشتہ کہیں اور ہونے لگا تھا۔ سگائی کی بات چیت ہو چکی تھی۔ مگر وہ لڑکی تپ محرقہ سے چل بسی تھی۔ ویسے وہ لڑکے کی کچھ بھی تو نہ لگی۔ لیکن مجھے کسی نے اس وہم میں ڈال دیا۔ اور میں نے ایک تولے کا "سوت تعویز" بنوا کر مترو کے گلے میں ڈال دیا۔

"وہ بے چاری تو ایک دن بھی مترو کی سوت نہ بنی پھر وہ مر کر مترو کے کیسے چمٹ گئی۔" کیلی کی ہنسی نکل گئی۔

"اری۔ شاید مرتے وقت اُس کے دل میں کوئی حسرت رہ گئی ہو۔ اس دُنیا میں۔" ماں نے بجھے ہوئے دل سے کہا۔

"موسی حسرت تو زندہ انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ ہم لوگ زندہ انسان کے دل کی حسرت تو دیکھتے نہیں لیکن مرے ہوئے انسان کی حسرت کو پُوجتے ہیں۔" کیلی نے کہا اور سرد آہ بھری۔

"کتنا ہی بڑا روگ کیوں نہ لگ جائے مگر آدمی تو وہی آدمی رہتا ہے۔" کیلی نے مترو کا چہرہ دیکھ کر سوچا، "مگر مترو کا تو جیون ہی بدل گیا ہے۔"

جیسے چھوٹے بچے رنگدار کاغذ کو کاٹ کر دھاگے سے اپنے منہ پر باندھ لیتے ہیں اور آنکھوں کی جگہ پر کاغذ میں دو چھید کر لیتے ہیں اور "ہو۔ ہو۔" کر کے اپنے ساتھیوں کو ڈراتے ہیں اور اپنی خاص آواز میں اس لئے نہیں بولتے کہ اُن کے ساتھی انہیں پہچان جائیں گے۔ کیلی کو محسوس ہوا کہ ویسا ہی مذاق کا کھیل مترو اپنے آنسوؤں سے کھیل رہی تھی۔ پیلے رنگ کی چمڑی مترو کے چہرے پر بندھی ہوئی ہے اور اُس میں آنکھوں کی جگہ پر دو چھید ہیں اور وہ دنیا کو ڈراتی نہیں ہے۔ بلکہ دُنیا سے خوفزدہ ہو کر اُس نے چُپ سادھ لی ہے۔ کہ اس کے اندر کی مترو کو کوئی پہچان نہ لے۔

"دیکھ تو مترو کون آیا ہے۔" مترو کی ماں نے مترو کے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"موسی تو باہر چلی جا۔ مجھے ذرا اس کے پاس اکیلی بیٹھنے دے۔" کیلی نے

متر و کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

متر و کی ماں چلی گئی اور دروازہ بند کرتے ہوئے کہنے لگی "میں ذرا دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔ صبح سے اس کے منہ میں کھیل تک اُڑ کر نہیں گئی۔"

کیلی کھاٹ کے پاس پیروں کے بل ہی بیٹھ گئی اور جھک کر متر و کے سر کے پاس اپنا منہ رکھ کے اُس نے دائیں بازو سے متر و کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک کیلی کا سانس متر و کے ماتھے کو چھوتا رہا اور کیلی کو اپنے چہرے پر کچھ گیلا گیلا سا محسوس ہوا۔ کیلی نے مُنہ اُونچا کر کے دیکھا متر و کی بند آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اُس پانی نے متر و کا گال بھی بھگو دیا تھا اور اس کے ساتھ چمٹی ہوئی کیلی کا گال بھی۔

"تو نے مجھے پہچانا ---؟" کیلی نے پھر منہ نیچے کر لیا اور متر و کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔

متر و نے اپنی پورائی ہوئی آنکھیں کیلی کے چہرے پر گاڑ دیں اور پھر متر و کے ہونٹوں میں سے ایک آواز اس طرح نکلی۔ جیسے ایک کنوئیں میں سے نکلتی ہو "کیلی"

کیلی نے متر و کو اس طرح گلے لگایا جیسے کوئی دُکھتے ہوئے بازو کو اپنے گلے سے لگا لیتا ہے۔

"یہ تو نے کیا حال کر لیا ہے اپنا؟" کافی دیر بعد کیلی نے متر و کے بالوں کو اپنی مٹھی میں لیتے ہوئے کہا۔

مترو کے ہونٹ ایک بار کھُلے اور پھر بند ہو گئے۔ اُس نے اپنی تھوک اس طرح اپنے گلے میں نگلی جیسے وہ اپنے حال کو بھی گلنے سے نیچے اُتار لینا چاہتی ہو۔

دروازے کے قریب آہٹ ہوئی۔ کیلی نے مڑ کر دیکھا۔ مترو کی ماں نے ہاتھ میں دو کٹورے پکڑے ہوئے تھے اور وہ کہہ رہی تھی "لے کیلی۔ شاید تیرے ہی ہاتھ خوش نصیب ثابت ہوں اور یہ تیرے ہاتھوں سے کچھ کھانے پینے لگے۔"

کیلی نے اُٹھ کر دودھ پکڑ لیا اور کہا "تم ہمت نہ ہارو موسی۔"

کیلی نے دونوں کٹورے پہلے ایک ٹرنک پر رکھ دیئے اور پھر آہستہ سے مترو کی کمر میں سہارا دے کر اُسے کھاٹ پر بٹھا دیا۔ آدھی رضائی کیلی نے مترو کے گھٹنوں پر ڈال دی اور آدھی رضائی کو اس نے پیٹھ کی طرف موڑ کر اُس کا تکیہ بنا دیا۔ کیلی جب دودھ کا کٹورا مترو کے مُنہ کے پاس لے گئی تو مترو نے منہ پھیر لیا اور بولی "میرے حلق سے اب کچھ بھی نیچے نہیں اُترتا کیلی۔"

"میرے ہاتھ سے اُتر جائے گا،" کیلی نے ہنس کر کہا اور پھر بائیں ہاتھ سے مترو کا منہ اوپر کیا اور دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا کٹورا اُس کے منہ سے لگا دیا۔

مترو نے ضد سے اپنے دانت بھینچ لئے اور کیلی نے نرمی سے کہا "دیکھ دیکھ ابھی موسی مجھ سے کیا کہہ رہی تھی۔ تیرے ہاتھ ہی شاید خوش نصیب ثابت ہوں۔ تو میرے ہاتھوں کو خوش نصیب بنا دے اور چپکے سے دودھ پی لے۔"

مترو کے آنسو رُک نہ سکے اور اُس نے جب مُنہ اُٹھا کر کیلی کی طرف دیکھا

تو کیلی کو یوں لگا جیسے مترو کی بورائی ہوئی آنکھوں میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے۔

"خوش نصیب۔ تیرے ہاتھ تو خوش نصیب ہی ہیں کیلی۔"

"نہیں۔ میرے ہاتھ اُس وقت خوش نصیب ہوں گے۔ جب تو میرے ہاتھ سے دودھ پی لے گی۔"

"بھلا کیلی۔۔۔۔"

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"بھلا بدنصیب کو چھو کر بھی کوئی خوش نصیب ہو سکتا ہے۔؟"

"اری مترو۔ تو بدنصیب کیسے ہے؟"

"میں بڑی بدنصیب ہوں۔"

"تو تے تو جو مُنہ سے مانگا وہ تجھے مل گیا تو بھلا بدنصیب کیوں ہوئی؟"

"بس یہی تو بات ہے نا اس کے لئے مجھے خدا بھی بخش نہیں سکتا"، مترو نے اپنا سر اپنے گھٹنے پر اس طرح رکھ لیا۔ جیسے اب اس کی گردن سے اس کے سر کا بوجھ اُٹھایا نہ جا رہا ہو۔

"اچھا میں خدا سے کہوں گی۔ کہ وہ تجھے بخش دے"، اور کیلی دودھ کا کٹورا پھر مترو کے منہ کے پاس لے گئی۔

"تو اُس سے کہے گی"، مترو کی آنکھ پھر بورا گئیں۔

"ضرور کہوں گی۔ مگر ایک بات ہے کہ تو یہ دودھ پی لے اور مجھ سے اقرار

کرتو روزانہ دودھ پی لیا کرے گی اور خود بخود روٹی بھی کھا لیا کرے گی۔"

"تُو تو پگلی ہے کیلی۔" متر و کی آنکھوں میں پھر ایک سکون سا پیدا ہوا اور وہ کہنے لگی "اب نہ مجھے خدا بخش سکتا ہے نہ دُنیا۔"

"اچھا کوئی نہ بخشے مگر میں بخش دوں گی۔" اور کیلی نے زبردستی دودھ کا کٹورا متر و کے مُنہ سے لگا دیا۔ اس بار متر و نے دانت نہ بھینچے اور دودھ پینے لگی۔ دو چار گھونٹ پی کر وہ اس طرح سانس لے رہی تھی جیسے وہ اپنے سارے بدن کا زور لگا رہی ہو۔ اور بار بار تھک جاتی ہو۔

خالی کٹورا جب کیلی نے کھاٹ کے نیچے رکھا تو متر و نے ٹرنک پر پڑے ہوئے دوسرے کٹورے کی طرف دیکھا اور اشارے سے کہا "دیکھ تو نے مجھے تو دودھ پلا دیا ہے۔ مگر خود نہیں پیا۔"

"تو نے مجھے دودھ پینے کے لئے کہا ہی نہیں تھا۔ اب تو نے کہا ہے۔ تو پئے لیتی ہوں۔" کیلی نے کٹورا ہاتھ میں پکڑ لیا اور پھر خالی کر کے کھاٹ کے نیچے رکھ دیا۔ کیلی متر و کی کھاٹ پر بیٹھنے لگی تھی کہ اُسے ایک خیال آیا۔ اُس نے اُٹھ کر دروازے کو اندر سے کُنڈی لگا دی۔ پھر کھاٹ پر بیٹھ کر رضائی کے کنارے کو اپنے پیروں کے اُوپر کرتے ہوئے اُس نے متر و سے کہا "اچھا اب بتا کونسی بات ہے جس کے لئے نہ تجھے خدا بخش سکتا ہے اور نہ دُنیا۔؟"

"میں نے ایک بہت بڑا پاپ کیا کیلی۔"

"کیا کیا ہے۔؟"

"بس۔ ۔ ۔ ۔ میں۔" مترو کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ کیلی کو ڈر محسوس ہوا کہ مترو کو غش آجائے گا۔" اُس نے کھاٹ کے پایہ کے پاس تھوڑی سی جگہ بنائی اور مترو کو ہاتھ کا سہارا دے کر لٹا دیا۔

"میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے کیلی" مترو نے پھر آہستہ سے کہا۔

"یوں کرو مترو۔ اگر تجھ سے ابھی نہیں بولا جاتا تو خاموش رہ۔ تھوڑی سی دیر کے لئے سوجا۔ میں تیرے پاس بیٹھی رہوں گی۔"

"مجھے نیند نہیں آتی کیلی۔ مجھے تو رات کو بھی نیند نہیں آتی اور تجھے جانا بھی ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔ تو جتنی دیر کہے گی۔ میں تیرے پاس بیٹھی رہوں گی۔"

"میں نے سوچا تھا۔ اب تو مجھ سے پھر کبھی نہیں ملے گی۔"

"کیوں بھلا۔؟"

"مجھ سے سب ناراض ہو گئے ہیں نا۔ میں نے سوچا تو بھی مجھ سے ناراض ہے۔"

"میں تو تجھ سے بالکل ناراض نہیں ہوں اور تجھ سے کون ناراض ہے؟"

"اور۔ ۔ ۔ ۔"

"دیکھ تو سہی۔ تیرے غم میں تیری ماں کا کیا حال ہو گیا ہے۔ کیا وہ تجھ سے

ناراض ہو سکتی ہے۔؟"

"نہیں۔ میں اُس کی بات نہیں کر رہی کیلی۔"

"پھر تجھ سے اور کون ناراض ہے؟ کیا وہ چالیسویں چک والے ناراض ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ شاید ناراض ہوں گے۔ مگر میں اُن کی بھی بات نہیں کر رہی ہوں۔ اُس کی۔۔۔۔" مترو نے یہ کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے وہ جس کی بات کر رہی تھی۔ آنکھیں بند کر لینے سے وہ اُسے دکھائی دے رہا ہو۔

"کس کی بات مترو؟" کیلی نے بات دوہرائی۔

"کیا تجھے پتہ نہیں لگتا۔۔۔؟"

"لگتا ہے۔ مگر میں تیرے مُنہ سے سُننا چاہتی ہوں۔"

"اچھا تو میرے مُنہ سے سُن لے۔ میں بخشے کی بات کر رہی ہوں۔"

"تجھ سے یہ کس نے کہا کہ وہ تجھ سے ناراض ہو گیا ہے؟"

"میرا دل کہتا ہے اور پھر اُس کا ناراض ہونا بھی سچا ہے۔ میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ میں نے اُس کی امانت بیچ دی۔"

کیلی کا دل بھر آیا اور وہ مترو کے مُنہ کی طرف دیکھ کر سوچنے لگی۔ "کیا یہ وہی مترو ہے۔ جس سے میں کہا کرتی تھی کہ تیرا دل خون اور گوشت کا نہیں بنا ہوا ہے۔ تیرا دل تو سونے کا بنا ہوا ہے جسے تو بیچنے لگی ہے اُس بنیے کے ہاتھوں۔" اور پھر کیلی کے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ "آج

بے چاری کے دل کو دُنیا کے تمام تفکرات نے آگھیرا ہے۔"

"وہ گھڑی ہاتھ نہیں آتی" مترو نے اس طرح کہا جیسے اُس کا رواں رواں بلک رہا ہو۔ پھر وہ اپنا ایک ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ کر کہنے لگی "میں نے اپنی تقدیر کی لکیریں خود ہی مٹا دیں۔"

"مگر تجھے یہ ہوا کیا مترو۔؟ میں تو سوچتی تھی کہ تجھے تو بخشا بھولے سے بھی یاد نہیں آئے گا۔"

"یہی تو دُکھ ہے کیلی۔ میں کہا کرتی تھی کہ اُس کے پاس تو اپنے کھانے کے لئے روٹی نہیں ہے وہ مجھے کہاں سے کھلائے گا اور اب جب کہ میں روٹی کھاتی ہوں تو وہ روٹی مجھے یوں لگتی ہے جیسے اس میں زہر ملا ہوا ہو۔"

کیلی کے سارے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی اور وہ سوچنے لگی "یہ کیا خدا کا عذاب ہے؟ جب آدمی کے پاس وقت ہوتا ہے۔ اُسے اپنے دل کا شعور نہیں ہوتا اور جب دل میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ تو اُس کے پاس وقت نہیں ہوتا۔"

"کسی کا کوئی قصور نہیں کیلی۔ یہ میرا اپنا قصور ہے۔ بس ایک بار تم سے بات کرنے کو میرا جی چاہتا تھا۔ وہ آج میں نے کر لی ہے۔ شاید اسی لئے میرا دم میرے سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ شکر ہے کہ میں نے تیری صورت دیکھ لی ہے۔"

"بس جی بھر گیا۔ میری صورت دیکھ کر؟ کیا ایک بار اُس کی صورت نہیں دیکھو گی۔ مرنے سے پہلے ؟"، کیلی نے پیار سے متروکے گال پر چٹکی لی۔

"جو بستر مرگ پر پڑا ہو اُس سے مذاق نہیں کیا کرتے کیلی۔"

"اُسے موت آ جاتی ہے جو مذاق کرتا ہو۔" کیلی نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر تھوڑے سے توقف کے بعد بولی "اگر تُو کہے تو میں ابھی تجھے اُس کی صورت دکھا دوں۔"

"جھوٹی کہیں کی۔"

"اگر میں سچی بن جاؤں تو مجھے کیا دو گی۔؟"

"تجھے اپنی جان دے دوں گی۔"

"تُو تو کہہ رہی ہے کہ تجھے جینا ہی نہیں ہے اور جان تجھے خدا کو دینی ہے پھر مجھے کون سی جان دو گی؟"

"جان کے سوا میرے پاس اور دینے کے لئے کیا ہے؟"

"مجھے اور کچھ لینا بھی نہیں ہے۔ مجھے جان ہی لینی ہے۔"

"پھر تو تو میرا خدا ہوئی نا۔ تو میری جان لے لینا۔"

"خدا۔ تو مرے ہوئے کی جان لیتا ہے۔ انسان زندہ لوگوں کی جان لیتا ہے۔ اگر تجھے اپنی جان دینی ہے تو تجھے جینا پڑے گا۔ یہ بات پہلے سوچ لے۔"

"مگر جینا کوئی اپنے بس کی بات تھوڑے سے ہی ہے۔ کیلی؟ اور اب میرا

جینے کو جی نہیں چاہتا۔"

"بڑی آئی اتنی سمجھ دار کہیں کی۔ یہ میں تجھے ابھی بتلائے دیتی ہوں کہ اگر ایک بار تو نے اُس کا منہ دیکھ لیا تو پھر تیرا جینے کو جی چاہے گا۔"

"اتنا کفر کیوں تولتی ہے کیلی۔ تو نے کون سے جن بھوت بس میں کر رکھے ہیں کہ تو آنکھ جھپکنے میں اُسے یہاں لے آئے گی۔"

"کسی پیر فقیر کے آگے دُعا کر دوں گی۔"

"پیروں فقیروں سے کچھ نہیں ہوتا کیلی۔ ماں نے میرے لئے کوئی جنتر منتر نہیں چھوڑا۔"

متو نے مایوس ہو کر کہا۔

"بے چاری ماں کو ایک جنتر منتر کا علم ہی نہیں تھا۔" کیلی ہنس پڑی۔

"تو نہ جانے کس وہم میں ہے کیلی۔ وہ تو مجھ سے ناراض ہو کر یہ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

"میں تو کہیں سے اُسے ڈھونڈھ ہی لاؤں گی۔ لیکن ایک بات بہت ہی مشکل ہے نا۔"

"کیا۔؟"

"یعنی اگر ایک بار تو نے اس کا مُنہ دیکھ لیا تو بھی کون سا تجھے صبر آجائے گا۔ اُسے میں تیرے پاس عمر بھر کے لئے باندھ کر کیسے بٹھاؤں گی۔؟"

"مجھے عمر بھر کی ضرورت نہیں۔ کیلی۔ ایک بار۔ بس ایک بار۔ اگر میں اُس کا منہ دیکھ لوں۔"

کیلی مترو کی باتیں سُن سُن کر حیران ہو رہی تھی "اس ظالم نے ہنستے ہنستے جس سے مُنہ موڑ لیا تھا۔ آج ایک بار اُس کا منہ دیکھنے کے لئے تڑپ رہی ہے" پھر کیلی نے سنبھل کر کہا "صرف ایک بار دیکھنے سے کیا بنے گا مترو۔ ان بیگانے ہاتھوں سے تو اُس سے بھلا کیا مانگ سکتی ہے؟"

"معافی تو مانگ سکتی ہوں" مترو نے کیلی کی جھولی میں اپنا سر رکھ دیا۔ بہت نڈھال ہو کر یعنی اگر اس کے بدن میں کچھ طاقت ہوتی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی۔

کیلی مترو کے سر کو دونوں ہاتھوں سے سہلاتے ہوتے بولی "اچھا تو پھر ہوا نہ وعدہ۔ میں ایک بار تجھے بخشے سے ملا دوں گی اور تو اپنی جان میرے حوالے کر دے گی اور میں جب تک چاہوں تجھے جینا ہو گا۔"

"اچھا میرے خدا۔ میں جیوں گی۔" مترو کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور پھر ایک چنگاری کی طرح بُجھ گئی۔ وہ کہنے لگی "مجھے یوں لگتا ہے کہ خدا مجھے اتنے دن جینے کے لئے نہیں دے گا جتنے دن تجھے اس کو ڈھونڈنے میں لگ جائیں گے۔" اور پھر مترو سر تا پا بجھ کر کہنے لگی "یہ بھی کیا معلوم اُس نے میری جانب سے منہ ہی موڑ لیا ہو۔ یہاں آنے کے لئے اس کے دل میں

ایک بار بھی ترس نہ آتے۔"

کیلی سوچ رہی تھی۔ متر و پتھر کی سِل کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ چُپ کی چُپ مگر اندر سے بھری بیٹھی تھی۔ پہچی تھی وہ کس سے بات کرتی۔ یہ بات نہ ماں کو سُنا سکتی تھی نہ حکیم کو۔"

"اچھا تو پھر یوں کر۔" کیلی نے لاڈ سے کہا "اُٹھ۔ نہا دھو۔ کپڑے تبدیل کر۔ چہرے پر کچھ رونق تو آتے۔ کسی کا انتظار کرنے کے لئے بھی تو بدن میں ذرا سی ہمت چاہیئے۔"

متر و کھاٹ کی پٹی کو پکڑ کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی مگر ہانپتے ہوئے کہنے لگی "تو مجھ سے جھوٹے وعدے تو نہیں کر رہی؟"

کیلی نے اگر متر و کی یہ باتیں اپنے کانوں سے نہ سُنی ہوتیں تو اُسے ہرگز یہ یقین نہ آتا کہ یہ متر و جو کبھی بخشے کو سیدھی طرح بُلایا نہیں کرتی تھی۔ ہمیشہ "راہگیرا" کہا کرتی تھی۔ آج بخشے کو ایک بار دیکھنا ہی زندگی کی سب سے بڑی نعمت سمجھ رہی تھی۔

"میں تو تجھ سے جھوٹا وعدہ نہیں کر رہی لیکن تجھ سے وہ جب کبھی ملے تو ضرور اُس سے کوئی وعدہ کر لینا۔ چاہے اگلے جنم ہی کا کوئی وعدہ۔ وہ بے چارا یہ جنم اُس وعدہ پر گزار دے گا۔"

"تو اُس کی بات تو یوں کر رہی ہے جیسے تو نے اس کے دل میں بیٹھ کر

دیکھا ہوا پگلی۔ مرد کی ذات ۔ کیا خبر وہ بدل گیا ہو۔،،

" متر د۔ آدمی اتنی دیر تک ہی بدلتا رہتا ہے۔ چاہے عورت ہو یا مرد۔ جب تک وہ اپنے آپ کو پہچان نہیں لیتا۔ اب تو ہی بتا۔ تو نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ کیا اب تو بدل سکتی ہے؟ پہلے ہی بدل گئی تھی۔ جب تُو نے اپنے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ اب تو نہیں بدل سکتی۔ پھر وہ کیسے بدلے گا۔؟"

کیلی نے دروازے کی کنڈی کھولی اور متر د کی ماں سے پانی گرم کروا کر متر د کو نہلانے لگی۔ متر د کو نئے کپڑے پہنا کر کیلی نے اس کے کان میں کہا "ہار سنگھار بھی کر لے کہ اس طرح ننگی بچی ہی رہے گی۔"

" مجھے تو اب کوئی انگوٹھی اور چھلا پورا ہی نہیں آتا اور میرا جی نہیں چاہتا کہ کسی کے گھر کی چیز پہنوں" متر د نے اپنے گیلے بالوں کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نچوڑا اور کہا "ان موئے زیوروں کے لئے میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا۔ اب تو یہ مجھے انگاروں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔"

اور پھر متر د نے گلے میں پڑا ہوا کالا دھاگہ توڑا اور پھر اس کے ساتھ بندھے ہوئے سونے کے ایک ٹکڑے کو پکڑ کر کہنے لگی "کیلی تو ایک اور ثواب بھی کما لے۔ ماں نے یہ جو طوق میرے گلے میں لٹکا دیا ہے یہ اُتروا دے میرے گلے سے۔ مجھے بہت برا لگتا ہے۔"

" یہ کیا ہے متر د۔؟"

"میں تو پاگل تھی ہی۔ مگر میری ماں بھی مجھے اچھا کرتے کرتے پاگل ہو گئی۔ کہیں سے سُن آئی تھی کہ میری جگہ پہلے کسی اور لڑکی کی بات چلی تھی۔"

"ہاں۔ ہاں سب مجھے موسی نے بتایا تھا۔ کہتی تھی یہ ایک "سوت تعویذ" بنوا کر مترو کے گلے میں ڈال دیا ہے۔"

"یہی وہ "سوت تعویذ" ہے۔ وہ ایک معصوم لڑکی ہو گی۔ اب اس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ چڑیل بن کر مجھے چمٹ گئی ہے۔"

"کیا اس پہ اُس کا نام لکھا ہوا ہے؟"

"نام ہی تو لکھا ہوا ہے۔ آ تجھے دکھاؤں کھول کر۔"

موٹے کالے دھاگے میں پرو دیا ہوا سونے کا ٹکڑا ایک چھوٹی سی ڈبیہ کی طرح بنا ہوا تھا۔ جو ہاتھ سے ایک ڈبیہ کی طرح کھُل بھی جاتا تھا۔ مترو نے اُسے کھولا۔ اُس میں ایک چھوٹا سا کاغذ پڑا ہوا تھا۔ جس پہ لکھا ہوا تھا "کیسری۔"

"بے چاری کیسری کو خواہ مخواہ چڑیل بنا دیا ہے۔ انھوں نے۔ اگر میں اُسے گلے سے اتاروں تو ماں ناراض ہو جاتی ہے اور اسے پہننے کو میرا جی نہیں چاہتا۔" مترو نے کہا۔

"تو یوں کر۔ اس میں سے کاغذ نکال کر پھینک دے۔ موسی کون سا کھول کر اسے دیکھے گی کبھی۔ باقی ایک دھاگہ ہی تو ہے۔ تو اُسے گلے میں پہنے رکھ۔" کیلی نے مشورہ دیا۔

"ہاں سے۔ میں یونہی اتنے دن تک پریشان رہی ہوں۔ یہ بات تو مجھے سوجھی ہی نہیں۔" مترو نے خوش ہو کر کہا اور پھر اپنے ناخنوں سے ڈبیہ میں پھنسا ہوا کاغذ نکالنے لگی۔

"مجھے ایک اور بات سوجھی ہے،" کیلی نے کہا اور کمرے میں کچھ ڈھونڈھنے لگی۔

"کیا ڈھونڈھ رہی ہے؟"

"مجھے ایک بہت ہی اچھا منتر آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی جگہ وہ منتر لکھ دوں بس ذرا سا کاغذ اور قلم دوات چاہیئے۔"

"چھوٹے بھائی کا بستہ یہیں کہیں پڑا ہوگا۔ اس کی کاپی میں سے کاغذ پھاڑ لے۔ قلم دوات تو میں نے ابھی یہیں دیکھی تھی۔ خبر نہیں کہاں دیکھی تھی۔ ہاں ۔۔۔ اس طاق میں پڑی ہے۔ میں نے ابھی کنگھی اُٹھاتے ہوئے دیکھی تھی۔"

کیلی کو جب کاغذ اور قلم دوات مل گئی تو اُس نے دُور کونے میں جا کر کاغذ پر کچھ لکھا اور پھر آس پاس سے کاغذ پھاڑ کر اُسے اتنا چھوٹا کر دیا کہ وہ سونے کی ڈبیہ میں پورا آجائے۔

"یہ میں اس کے اندر رکھ دوں۔؟" کیلی نے مترو کے گلے میں پڑے ہوتے تعویذ کو پکڑ کر کہا۔

"یہیں رکھ دے" مترو نے اور آگے ہو کر کہا۔

"کیا پڑھو گی ایک بار۔؟"

"مجھے پڑھ کر کیا لینا ہے۔ تو نے جو لکھا ہو گا ٹھیک ہی لکھا ہو گا۔ میرے لئے تو یہی بہت ہے کہ تُو نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے۔"

"پھر بھی ایک بار پڑھ لے اور اس میں جو منتر لکھا ہوا ہے اُسے زبانی بھی پڑھا کرنا"

مترو نے جھک کر کیلی کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کی طرف دیکھا۔ کاغذ پر لکھا ہوا تھا "بختا" مترو کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

کیلی اُس کاغذ کو ڈبیہ میں رکھتے ہوئے اور اُسے بند کرتے ہوتے ہنس پڑی۔ "بھلا بیگانوں کے نام کو گلے سے لگا کر کیا رکھنا۔ کوئی گلے سے لگائے تو اپنوں کا نام لگائے"

کیلی ہاتھ میں کنگھی لے کر دھیرے دھیرے مترو کے بال سنوارنے لگی۔

"مجھ سے اب بیٹھا نہیں جاتا کیلی،" مترو نے تھک کر کہا۔

"کوئی کھلے دندانوں والی کنگھی تو دو موسی۔ بال تو بالکل جڑے پڑے ہیں۔" کیلی نے مترو کی ماں کو آواز دی اور پھر مترو کی پیٹھ کو اپنے گھٹنے کا سہارا دے کر اُس نے مترو کے کان میں کہا "آج تو تجھے مراد ملے گی۔ تو ابھی سے ہی تھک گئی۔؟"

"اب کیسی مراد۔ اور کس سے مانگوں۔؟" مترو نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔

کیلی نے پھر مترو کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا "بچ بخشنے کی مراد۔ اور مجھ سے مانگ لے۔"

"تم آگ لگا ہی سکتی ہو کہ بجھا بھی سکتی ہو؟" مترو نے روہانسی ہو کر پوچھا۔

"لگا تو میں نے دی ہے اور اگر کوئی منت مانتے تو بجھا بھی دوں گی۔" کیلی نے اُسی طرح ہنستے ہنستے کہا۔

" ایک بار کہہ تو دیا کہ اپنی جان تجھ پر نثار کر دوں گی۔ جس طرح لوگ پیر کے تکے بکرا چڑھاتے ہیں اور بتا میں کیا کہوں؟"

متر د کی ماں ہاتھ میں کنگھی لئے ہوئے جب اندر آئی تو دونوں سہیلیوں کو یوں باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے رو پڑی "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیرے آتے ہی متر د کا رنگ پھر جائے گا تو میں سر کے بل جا کر تجھے پہلے ہی سے آتی کیلی۔"

"رنگ کی پُڑیا تو میں نے ابھی کھولی نہیں موسی۔ تو دیکھنا متر د کا رنگ تھوڑے ہی دنوں میں کیسا ہو جاتا ہے" کیلی نے کہا اور متر د کی ماں کے ہاتھ سے کنگھی پکڑتے ہوئے کہنے لگی "موسی میں شاید آج کی رات یہی یہاں رہوں۔ میں متر د کو رات اپنے گھر لے جاؤں گی۔ ابھی متر د سے مل کر میرا جی نہیں بھرا۔"

"کیا متر د میری بہت لگتی ہے جو تو مجھ سے پوچھ رہی ہے؟ اگر وہ جا سکتی ہے تو چلی جاتے۔ ورنہ تو ہی یہاں رہ جا آج کی رات۔"

"رہنے کو تو میں رہ جاتی موسی۔ لیکن تو جانتی ہے کہ اس وقت مجھے ماں کے پاس رہنا چاہیئے۔"

"وہ تو تو ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ لیکن بیٹی مجھے اتنی جلدی کیا ہے جانے کی تو وقت پر آتی ہی نہیں۔ تو جب آئی تو ہم تیرے باپو کے پھول بھی چُن چکے تھے۔"

" مجھے تو موسی جس وقت خط ملا۔ میں آگئی۔ نہیں تو کیا میرا جی نہیں چاہتا تھا۔

باپو کی صورت دیکھنے کو؟ اس سے پہلے مجھے کسی نے خبر ہی نہیں دی۔"

"خبر سے کیا ہوتا۔ بیمار تو وہ برسوں سے تھا تجھے معلوم ہی ہے۔ بس اسی طرح اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔"

کیلی جب متّرو کے بالوں میں کنگھی کر چکی تو متّرو کی چوٹی ٹھیک کرتے ہوئے بولی: "میں اس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرے دھیرے اسے اپنے گھر لے جاتی ہوں۔"

"سالن تیار ہے۔ میں منٹوں میں گرم گرم روٹی بنائے دیتی ہوں۔ تو بھی ایک آدھ کھا لے اور اسے بھی کھلا دے۔" متّرو کی ماں نے اتنا کہا اور باہر چولہے میں چلی گئی۔

"دیکھنا کیلی۔ میرا ماتھا مجھے گرم لگتا ہے۔" متّرو نے کھاٹ پر لیٹتے ہوئے کہا۔ کیلی نے متّرو کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اُس کی قمیض اُٹھا کر اُس نے اس کا بدن چھُوا۔ ہے تو تھوڑا سا گرم لیکن تو فکر نہ کر۔ اُٹھنے بیٹھنے سے ذرا حرارت ہو گئی ہو گی۔ میں تمہیں جاتے ہی لٹا دوں گی اور پھر سارا دن تیرا سر دباتی رہوں گی۔"

ماں دونوں لڑکیوں کے لئے ایک ہی تھالی میں روٹی پروس کر لے آئی۔ کیلی نے بھی روٹی کھائی اور تھوڑی سی متّرو نے بھی۔ پھر کیلی نے متّرو کے گرد گرم چادر لپیٹ دی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرے دھیرے اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

"یہ تو نے اپنی کیا حالت کر لی ہے مترو؟" کیلی نے راستہ میں کہا اور دیکھا کہ مترو کی جوتی بھی اُس کے پیروں میں اتنی کھلی ہو گئی تھی کہ "کھڑ اپچ کھڑ اپچ" بج رہی تھی۔

ان کے پہنچتے ہی کیلی کی ماں نے مترو کے لیئے چارپائی بچھادی اور لحاف دے کر مترو کو چارپائی پر لٹا دیا۔

"جب سے باپو کا انتقال ہوا ہے۔ میں تجھے منہ دکھانے بھی نہیں آئی موسی کیلی ہی مجھے مقام کر کے آئی ہے"، مترو نے کہا اور اُسے محسوس ہوا کہ آج کیلی کے باپو کی چارپائی خالی دیکھ کر اُس کے دل میں درد ہو رہا ہے۔ وہ کیلی کو پاس بٹھا کر اُس کے باپو کی کوئی بات کرنے لگی۔ گذشتہ دنوں میں کیلی کے باپو سے اس کو کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔

"باپو کا دل بہت اچھا تھا۔ خالص سونا۔ اس کے بدن نے اُسے شکست دے دی تھی ورنہ بہت ہی دلیر انسان تھا"، مترو نے یہ بات تاسف سے کہی اور کیلی کی طرف منہ کرتے ہوتے کہنے لگی۔ "میں تو اپنے ہی دکھوں میں کھو گئی میں نے ایک بار بھی تیرا حال نہیں پوچھا۔ تو نے کیسے اپنے دل کو بہلا لیا کیلی مجھے تیری کہی ہوئی سب باتیں یاد ہیں۔"

کیلی نے اپنی بات کو ٹال دیا اور دھیرے سے مترو کی بانہیں دباتی ہوئی اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔

کیلی کی ماں نے کیلی سے روٹی کے لئے پوچھا۔ کیلی نے جواب دیا "روٹی تو موسی کے گھر سے کھا آئی ہوں۔ تم رات کے لئے کچھ بنا لو۔ چاہے دال ہی بنا دو۔ بڑیاں ڈال کر چنے کی دال چڑھا دو" اور پھر کیلی نے مترو کی طرف منہ پھیر کر پوچھا۔ "تجھے کسی چیز سے پرہیز تو نہیں۔؟"

"مجھے کس چیز سے پرہیز ہوگا۔"

"میں نے سوچا کہ بڑیاں تیرے لئے بھاری نہ ہوں؟"

"میں کون سا دال کا کٹورا پیوں گی۔ دو نوالے کھانے ہیں۔ لگا کر کھا لوں گی۔" مترو نے ایک سرد آہ بھری۔ اور کیلی سے آہستہ سے کہنے لگی "پرہیز تو مجھے ایک ہی چیز سے ہے جس کا کوئی مجھے علاج نظر نہیں آتا۔"

"میں علاج ڈھونڈ دوں گی۔ بتلا تجھے کس چیز سے پرہیز ہے؟"

"بس ایک پرہیز کہ مجھے پھر کبھی وہاں نہ جانا پڑے۔"

"سسرال۔؟"

"ہاں۔"

"تجھے ہو کیا گیا ہے مترو۔ جانے کے لئے بھی بیقرار تھی اور اب آنے کے لئے بھی بے قرار ہے۔"

"بس ایک پردہ تھا جو ہٹ گیا۔"

"اب تجھے وہاں کیسا محسوس ہوتا ہے۔؟"

"بس یہی محسوس ہوتا ہے کہ میرے بدن پر چھوٹن چڑھتی جا رہی ہو۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی مجھے غش آنے لگتا ہے۔"

"ہائے ری قسمت۔"

"دُکھ بھی تو مجھے اِسی بات کا ہے کیلی کہ میں خود ہی اپنی چور بن گئی ہوں"

"اب تجھے بخشا بہت یاد آتا ہے۔؟"

"یاد کیا آتا ہے وہ تو بھوت بن کر مجھ سے چمٹ گیا ہے۔ کیلی۔ سوتے جاگتے ہر وقت وہی میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ لیٹے لیٹے۔ اُس کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں......"

"اب بتا۔ میں کونسی راہ نکالوں مترو۔"

"میں کیا بتاؤں۔ میں نے تو اپنے ہاتھوں اپنے پیر کاٹ لئے ہیں،" مترو اور کیلی ایک ہی چارپائی پر پڑی رہیں اور پھر لیٹے لیٹے اونگھنے لگیں۔

ماں کی آواز پر کیلی کی آنکھ کھل گئی۔ ماں کہہ رہی تھی "دن رہتے ہی کھانا کھالو۔ مجھے ذرا پٹواری کے پاس جانا ہے۔ زمین کی بات کرنے۔"

"اُٹھ مترو،" کیلی نے مترو کو بھی جگایا اور پھر کہنے لگی "میں یہاں تھالی اُٹھا لاتی ہوں۔ تجھے باہر اس وقت سردی لگے گی۔"

"ایک لکڑی تو دیتا بیٹی۔ اکیلی لکڑی جلتی ہی نہیں چولہے میں،" ماں نے چولہے میں سے آواز دی۔

کیلی نے ایک بار مترو کی طرف دیکھا اور ہنس کر ماں کو جواب دیا "کیوں ماں اکیلی لکڑی چولہے میں کیوں نہیں جلتی۔؟"

"تو اتنی بڑی ہو گئی ہے تجھے اتنا بھی معلوم نہیں۔ اکیلی لکڑی تو بالکل دھواں ہوتی ہے" ماں نے چولہے میں پھونکیں مارتے ہوئے کہا۔

مترو کو ماں بیٹی کی بات پر ہنسی آ گئی اور وہ چارپائی پر اٹھتے ہوئے کہنے لگی "میں بھی آتی ہوں چوکے میں۔ چولہے کے پاس کیا سردی لگے گی۔؟"

کیلی۔ ڈیوڑھی میں لکڑی لینے گئی۔ تو اُسے یوں محسوس ہوا کہ باہر کسے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ کیلی جلدی سے لکڑی وہاں رکھ کر دروازے کی طرف گئی۔ دروازے پر دستک دیتا ہوا بخشا اپنی ترنگ میں کچھ گا رہا تھا۔ کیلی نے کان لگا کر سنا مگر بخشے کے الفاظ اُسے صاف سُنائی نہ دیئے۔ دروازہ کھولتے ہوئے کیلی نے بخشے سے ہنس کر پوچھا "آج تو تُو بڑا گاتا ہوا آ رہا ہے۔ کیوں کیا بات ہے۔؟"

"ہمارا گانا بھی تو رونا ہے بہن کیلی۔"

"پھر بھی بتا تو سہی کیا گا رہا تھا۔؟" کیلی دروازہ بند کر کے وہیں ڈیوڑھی میں کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "تیرا پورا شعر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تُو کچھ رنگ کی "وَتّی ٹیکی"۔ کہہ رہا تھا۔"

بخشا پہلے تو کچھ جھینپ سا گیا اور پھر کہنے لگا "آج کوئی بات کر رہا تھا کہ

وہ یہیں ہے آج کل۔ اور بہت بیمار ہے۔ آج دل کو چین نہیں آرہا تھا۔ میں سارا دن کھیتوں میں گھومتا رہا اور جو منہ میں آیا بولتا رہا۔"

"ابھی ابھی کیا کہہ رہا تھا؟"

"اپنے دل کو تو یونہی جنون سا ہے کیلی۔ کہہ رہا تھا ؎

ہم اس دُنیا کے اِکے جیت لیتے

اگر تو رنگ کی دُگی بھی لگا دیتی"

"اور اب اگر وہ رنگ کا کاٹ لگا دے تو پھر۔؟"

"یہ رنگ کے اِکے نہ جانے کن لوگوں کی قسمت میں ہوتے ہیں۔"

"شاید سنجنے کی قسمت میں ہی ہیں۔"

"ہمیں تو وہ ملی جو رنگ کی دُکی کھیلنے سے بھی جھجک گئی۔"

کیلی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ چوکے سے ماں کی آواز آئی "تو کہاں غائب ہو گئی کیلی ۔۔۔؟"

کیلی نے ہاتھ میں ایک لکڑی پکڑی اور چوکے میں جا کر ماں سے کہنے لگی۔

"تو نے خود ہی تو کہا تھا کہ اکیلی لکڑی چولہے میں نہیں جلتی۔ میں دوسری لکڑی لانے گئی تھی۔"

"اور لکڑی لانے میں کیا اتنی دیر لگتی ہے۔؟ دیکھ تو دھواں ہی دھواں ہو گیا ہے"، ماں نے کہا اور چولہے میں دوسری لکڑی لگاتے ہی زور سے

پھونک ماری۔

"دیر ہی تو ہو گئی ماں" اور ہاتھ سے ایک اور مونڈھا رکھتے ہوتے بولی۔ بختے" اندر آجا۔"

متّرو اپنے مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے بالکل ہلدی کی گانٹھ بن گئی۔ اور پھر کیلی نے دیکھا کہ متّرو کی آنکھیں صبح کی طرح بورا گئی ہیں۔

" یہاں تو بہت دھواں ہے ماں۔" کیلی نے متّرو کو مونڈھے پر سے اُٹھاتے ہوتے کہا۔

" لڑکی کی طبیعت پہلے ہی خراب ہے اور تو اُسے یہاں باہر لے آئی ہے اسے چارپائی پر لحاف دے کر بٹھا دے۔ میں تجھے روٹی اندر ہی دے آؤں گی۔" ماں نے چولہے پر توا رکھا اور پھر کپڑے سے بیلن کو پونچھتے ہوتے بولی۔ "اب تو میرا بیٹا آگیا ہے۔ یہ دے آئے گا تجھے تھالی۔"

بختے نے متّرو کو دیکھا تو اس کا سر چکرا گیا اور وہ دروازے کی بتّی سے سٹ کر دروازے کی بتّی ہی بن گیا۔ متّرو نے اپنی آنکھوں کا سارا زور لگا کر بختے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ چوکے میں دھواں بہت تھا یا متّرو کی آنکھیں ہی کچھ زیادہ ہی نم آلود تھیں۔ کہ اُسے بختے کا چہرہ اچھی طرح دکھائی نہ دیا۔

کیلی نے متّرو کو بازو کا سہارا دیا اور اندر آکر اُسے کھاٹ پر لٹا دیا۔

ماں نے توے پر سے روٹی اتاری اور ایک کٹوری میں دال ڈال کر بختے کو

تھالی دے دی ۔ یہ فدا لڑکیوں کو دے آ بخشے ۔ دوسری روٹی اُتار کر تجھے دیتی ہوں ۔"

بخشو نے تھالی پکڑ لی ۔ لیکن اُس کے پاؤں اس طرح کانپ رہے تھے جیسے وہ بے حد شراب پی گیا ہو ۔ اُس کا پاؤں دہلیز سے ٹکرایا اور اُس نے بڑی مشکل سے تھالی کو گرنے سے بچایا ۔ کیلی نے آگے بڑھ کر بخشے کے ہاتھ سے تھالی لے لی اور چارپائی پر تھالی رکھتے ہوئے اس نے بخشے کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے بھی چارپائی پر بٹھا لیا ۔

"اری اُٹھ کر رنگ کا اِکا دے ۔" کیلی ہنس کر متّو سے کہنے لگی ۔ "آج بخشا کو دنیا کی بازی جیتی ہے ۔"

"متّو کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں بخشے پر پڑیں اور پھر وہیں جم کر رہ گئیں ۔ مجھے .... معاف .... "متّو کے ہونٹوں سے نکلا اور پھر متّو کے ہونٹ کانپنے لگے ۔ بخشے نے ایک بار آنکھیں بند کر لیں اور پھر آنکھیں کھول کر اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ خواب نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی ۔

متّو نے سر جھکا لیا ۔ جیسے اب وہ بخشے کی صورت نہیں بلکہ بخشے کے قدم ڈھونڈھ رہی ہو ۔ بخشے نے چارپائی سے اُٹھ کر متّو کا سر اپنے سینے سے لگا لیا ۔

کیلی کو وقت کا خیال نہ آتا اگر چولہے سے ماں کی آواز نہ آتی "یہ لے ۔ میں نے تیری روٹی بھی پروس دی ہے بخشے ۔ تھالی پکڑ لے ۔" کیلی جلدی سے اٹھی

اور ماں سے دوسری تھالی لانے کے لئے چوکے میں چلی گئی۔

"ماں۔ اچار کی ایک پھانک بھی دے دو۔" کیلی چوکے میں دیر تک کھڑی رہنے کے خیال سے ماں سے کہنے لگی۔

"تختے پر سے اُتار لے اچار کا برتن" ماں نے پچھلی طرف تختے کی اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔

کیلی نے آہستہ سے برتن اُٹھایا اور پھر برتن کے منہ پر بندھے ہوئے کپڑے کو آرام سے کھولا۔ لکڑی کے چمچے سے اچار نکالنے لگی۔ وقت کو اور طول دینے کے لئے کیلی نے ماں سے کہا "کتنا پیلا اچار ہے یہ پچھلے برس کا ہے یا نیا ہے۔۔؟" آم کی پھانک کو کیلی نے تھالی میں رکھا اور پھر اچار کے برتن کو چراغ کے قریب لے جا کر کہنے لگی "مرچ تو مل گئی ہے۔ مگر اس میں لسوڑے نہیں ملے۔"

"بیٹی پچھلے سال والا اچار ہی ہے۔ تیرا باپ تو اچار کم ہی کھاتا ہے۔ میں ہی کبھی کبھی ایک آدھ پھانک لے لیا کرتی تھی۔ ختم کیسے ہوتا۔ ذرا نیچے دیکھ۔ اس میں ابھی کچھ لسوڑے ہوں گے۔"

کیلی جتنی دیر کر سکتی تھی۔ اُس نے کر لی اور پھر روٹی کی تھالی ہاتھ میں لے کر اُس نے اندر آ کر منترو سے ہنستے ہوئے کہا "دیکھا۔ آج ہی صبح میں نے ایک منتر تیرے گلے میں باندھا تھا۔ کس قدر جلد اُس منتر نے اپنا اثر دکھایا۔"

" موئی۔ تو نے مجھے صبح کیوں نہ بتایا۔ تو نے اپنی زبان کیوں بند کر کے رکھی ہوئی تھی۔" امرو نے کیلی کے بازو پر ایک چٹکی لی۔

" زبان بند کر کے کیوں نہ رکھتی۔ میں نے مٹھی میں لعل چھپایا ہوا تھا،" کیلی چارپائی پر بیٹھ کر روٹی کی تھالی گھٹنوں پر رکھتی ہوئی ہنس پڑی۔ پھر کہنے لگی " بھئی۔ جلدی سے روٹی کھا لو۔ ورنہ ماں بہت اتاؤلی ہو جائے گی۔"

بخشے نے روٹی کا ایک نوالہ توڑ کر روٹی پر پڑے ہوئے مکھن میں اسے گوندھا اور پھر امرو کے منہ میں ڈال دیا۔ " پہلے تو کہا کرتے تھے کہ ہیر چوری بنایا کرتی تھی اور رانجھے کو کھلایا کرتی تھی۔ اب اُلٹا زمانہ آگیا ہے اب رانجھا چوری بناتا ہے اور..... " کیلی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

" اگر مجھے رانجھا بنایا ہے آج میں کیلی تو تُو بھی سہتی بن جا۔ اور ہیر کو فقیر کے ساتھ بھیج دے۔ تو بھی مراد پائے گی۔" بخشے نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

کیلی کو دیپک یاد آگیا اور وہ بخشے کی چٹکی کو ہنس کر برداشت کرتے ہوئے کہنے لگی " مگر یہ دیکھو کہ سہتی کو تو مراد پھر بھی مل گئی تھی مگر رانجھے کو ہیر کہاں ملی تھی۔ بے چارے تھوڑے ہی دور گئے تھے کہ پکڑے گئے۔"

" تھوڑی ہی سی مسافت تو ساتھ چل کر دیکھ لی۔" بخشے کی جگہ امرو نے جواب دیا۔

" اگر اتنی ہی ہمت ہے تو اُٹھ کر پیروں میں جوتی پہن لے۔ باہر کی کنڈی

میں کھولے دیتی ہوں۔" کیلی نے کہا اور روٹی لانے کے لئے چوکے میں چلی گئی۔

ماں نے ان تینوں کو روٹی کھلائی۔ خود کھائی اور پھر بخشے سے کہنے لگی "میں ذرا پٹواری کے یہاں ہو آؤں تو میرے آنے تک یہیں بیٹھنا۔ لڑکیاں اکیلی ہیں"

ماں کے چلے جانے کے بعد وقت اس طرح اُڑنے لگا۔ جیسے اُس کے پَر لگ گئے ہوں۔ مترو کا روگ دہلیز سے باہر جا بیٹھا اور کچھ لمحوں کے لئے مترو کو محسوس ہوا کہ اُسے کبھی مرض لگا ہی نہیں تھا۔ ماں نے واپس آکر جب دروازہ کھٹکھٹایا تو تینوں نے باہر حیران ہو کر دیکھا کہ رات کافی ہو چکی تھی۔ بخشے نے بڑی تشنہ کام آنکھوں سے مترو کی طرف دیکھا اور پھر جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

مترو نے ایک بار جاتے ہوئے بخشے کی قمیض کا دامن پکڑ لیا اور پھر اپنی ساری زبان اپنی آنکھوں میں ڈال کر اُس کی طرف دیکھا "نہ جا"

ماں کمرے کی دہلیز میں تھی جس وقت کیلی نے بلند آواز میں کہا "کل جلدی ہی آجانا بخشے۔ پھر ہمیں جانا بھی تو ہوگا۔ گاڑی کتنے بجے جاتی ہے؟"

"کیا کل ضروری جانا ہے۔ کیا تیرے پیچھے وہاں دو دن کام نہیں چلتا؟" ماں نے کیلی کی طرف منہ پھیر کر کہا۔

"یہی۔ مجھ سے راستہ میں بار بار کہہ رہا تھا۔ کہ دو دن سے زیادہ نہیں رہیں گے۔ میری طرف سے تو۔۔۔" کیلی نے اپنی بات اپنے ہونٹوں پر رہنے دی۔ وہ تو کہنے والی تھی۔ کہ "میری طرف سے تو مجھے چاہے عمر بھر یہیں رکھ لو"

"کیوں بخشے ؟" ماں نے پوچھا۔

"موسی۔ شاہ نے مجھ سے تاکید کی تھی کہ دوسری رات سے تیسری رات نہ ہونے پائے۔ وہاں کسی کام وغیرہ کا جھگڑا ہے"، بخشے نے بتایا۔

"ہاں۔ دوسری رات سے تیسری رات نہ ہونے پائے"، ماں نے ایک اور چارپائی بچھاتے ہوئے اور اس پر دری رکھتے ہوئے کہا۔ "جیسے کام وغیرہ کے سارے جھگڑے اسی کو تو وہاں جاکر نپٹانے ہیں۔"

"اگلی بار تو میں تجھے بھی لے جاؤں گا موسی۔ بس تو تیار رہنا"، بخشے نے کہا۔

"اور مجھے۔۔؟" مترو نے دھیمی آواز میں کہا اور اُس کی یہ بات صرف بخشے کو سنائی دی۔

"میں تجھے ضرور لے جاؤں گا۔ میں تجھے اتنا بتلائے دیتا ہوں"، بخشے نے جب یہ بات دوبارہ لی۔ تو وہ مترو کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مترو نے شرما کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ بخشا دل تھام کر باہر چلا گیا۔

"میں ذرا مترو کے پاس لیٹ لوں۔ پھر میں اپنی چارپائی پر جاؤں گی۔ تم دیا بجھا دو ماں۔" کیلی نے کہا اور مترو کے ساتھ لیٹتے ہوئے اُس نے مترو کے کان میں کہا "ذرا قریب تو آ۔ موئی۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے بخشا ہی سمجھ لے۔"

مترو کیلی سے لپٹ گئی اور اُس نے آہستہ سے کہا "میں نہ جانے کس جنم میں تیرا یہ احسان چکا سکوں گی۔ کیلی! اس جنم میں تو چکا نہیں سکوں گی۔"

کیلی نے مترو کے کان میں جواب دیا۔"اس جنم میں بخشنے کا احسان چکا لے اور اگلے جنم میں میرا۔"

دوسرے دن صبح سویرے جب کیلی کی آنکھ کھلی تو کیلی نے ساتھ پڑی ہوئی مترو کی طرف دیکھ کر کہا۔"میں یہیں سوئی رہی ساری رات؟ سوچا تھا۔ ابھی اٹھ جاؤں گی۔ پھر جاگ ہی نہیں سکی۔ تجھے رات کو تکلیف ہوئی ہوگی مترو۔"

"مجھے تو ایسی نیند آج تک کبھی آئی ہی نہیں تھی کیلی۔ آج نہ جانے کیا کھا کر سوئی تھی۔ کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔" مترو نے کہا اور چارپائی سے اٹھتی ہوئی کیلی کو پھر چارپائی پر بٹھا لیا۔

"کتنے بجے ہوں گے ماں؟" کیلی نے بلند آواز میں ماں سے پوچھا۔ باہر چوکے میں آہٹ سے کیلی کو پتہ چل گیا تھا کہ ماں چوکے میں ہے۔

"دن کافی نکل آیا ہے،" باہر سے ماں کی آواز آئی۔" اٹھو منہ ہاتھ دھو لو۔ اور کچھ کھا لو۔ پھر تو کہتی ہے کہ گاڑی بھی پکڑنی ہے۔"

"بس آج کا دن اور رہ جا کیلی۔ بس آج کا دن" مترو نے لجاجت آمیز لہجہ میں کہا۔

"اور تو کیا یہ سوچ رہی ہے کہ کل تجھے اطمینان نصیب ہو جائے گا" کیلی نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر اسے رات کا خواب یاد آ گیا" مترو۔ رات میں نے بڑا ہی عجیب خواب دیکھا۔"

"کیا — ؟"

"کیا دیکھتی ہوں کہ تُو اور میں دونوں ایک برگد کے نیچے بیٹھ کر باتیں کر رہی ہیں اور، ہم دونوں باتیں کرتی رونے لگتی ہیں۔"

"پھر — ؟"

"اور پھر برگد میں سے میرا باپو نکل آیا اور پھر وہ، ہم دونوں کے سر پر پیار دینے لگا۔"

"باپو نے کوئی بات بھی کی ؟"

"بات پر ہی تو میں حیران ہو رہی ہوں۔ کہتا تھا، تم رو و نہیں تمہیں ابھی بہت دُور جانا ہے۔ اُٹھو، ہمت کرو۔"

"ہمیں بھلا کہاں جانا ہے کیلی ؟"

"یہی تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے خواب میں ہم دونوں نے ایک ایک گٹھڑی کپڑوں کی پکڑی ہوئی تھی۔ جیسے، ہم کسی دوسرے شہر میں جا رہی ہوں۔"

"بہت ہی عجیب خواب ہے۔"

کیلی اور مترو خواب کی بات سوچتے سوچتے باہر چوکے میں آ بیٹھیں اور پانی گرم کر کے منہ ہاتھ دھونے لگیں۔ ماں دودھ لانے چلی گئی تھی۔ رات کے دودھ کی چائے بنا کر دونوں پی رہی تھیں کہ اچانک بخشا اندر آ گیا۔ کیلی کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ اس لئے کیلی نے بخشے کو دیکھ لیا۔ دروازے کی طرف

مترو کی پلیٹھ تھی۔ اُسے بخشے کی آمد کا پتہ نہ چلا۔ بخشے نے مترو کے پیچھے بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ مترو کی آنکھوں پر رکھ دیئے۔ مترو ڈر گئی اور چلسے کا کٹورا اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔

"چوروں کی طرح کیوں آتا ہے؟" کیلی ہنس پڑی۔

"باہر کا دروازہ تم نے چوروں کے لئے خود ہی کھول رکھا تھا" بخشے نے جواب دیا۔

"دروازہ تو شاید ہاں کھول گئی ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میرا مطلب تھا کہ تو چوروں کی طرح کیوں آتا ہے۔ آتا ہے تو ڈاکوؤں کی طرح آ۔"

"تو اجازت دے دے کیلی۔ میں ڈاکوؤں کی طرح آتا ہوں اور اُلٹے پاؤں اُسے لے کر چلا جاتا ہوں۔ کل چاہے میں راستہ ہی میں مارا جاؤں۔ مجھے کل کا غم نہیں۔"

"کیا تمہاری یہ مرضی ہے کہ میں آج کا دن ہنس لوں اور پھر کل تم دونوں کو بیٹھ کر روؤں۔"

"ہمیں صرف تو ہی تو روئے گی کیلی۔ اور ہمیں کون روئے گا۔"

"اور تو کوئی روئے گا نہیں۔ سب کی جگہ مجھے ہی رونا پڑے گا۔ یہ بھی مجھ سے اتنا نہیں رویا جائے گا۔ تم مجھے ابھی دونوں زندہ ہی دکھائی دیتے رہو۔"

"ایسے جینے کا کیا ہے کیلی۔ اس سے تو مرے اچھے" بخشے کی جگہ مترو نے

جواب دیا۔

"اری۔ جیتے رہے تو پھر بھی کبھی میل ہو سکتا ہے مر گئے تو پھر کیا ملیں گے۔"

کیلی نے کہا۔

"پھر کب ملو گی کیلی۔؟" سترو نے منت کرتے ہوئے پوچھا۔

"تو ذرا اب اچھی ہو جانا۔ یہ جو منہ تو نے نکالا ہوا ہے اس سے تو تو کھاٹ پر سے نہیں اُٹھ سکتی۔"

"اب میں اچھی ہو جاؤں گی۔ بس دیکھ لینا تو۔ میں اب اچھی ہو جاؤں گی۔ سال میں کبھی ایک بار مجھے اُس کا منہ دکھا دیا کرنا۔"

"کیا صرف اتنے پر تسلی ہو جائے گی۔؟"

"چلو۔ بس کر لوں گی۔ دیوالی اور بیساکھی بھی تو سال میں ایک بار آتی ہے۔ کون سی روز آتی ہے۔"

"اچھا تو اب تو نگوڑی ہو جا۔ اگلے مہینے میرے پاس کچھ روز رہنے کے لئے آ جانا نا۔" کیلی نے کہا اور اُٹھ کر اپنے کپڑے سنبھالنے لگی۔

ماں دودھ کی بالٹی بھر کر لے آئی اور دودھ کو پتیلے میں چھانتے ہوئے کیلی سے کہنے لگی "یہ لکڑی گیلی لگتی ہے۔ باہر نکال دے میں چھال لاتی ہوں اُتار کر۔"

"تو بیٹھ جا موسی۔ میں اُتار دیتا ہوں۔" بچنے نے کہا اور باہر کی ڈیوڑھی میں پڑی ہوئی لکڑیوں پر سے چھال اُتارنے لگا۔

آنگن میں پڑی، موتی چوکی پر بیٹھ کر متو کنگھی کر رہی تھی۔ ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے بخشے کو اس کی آدھی چوکی دکھائی دے رہی تھی۔ بخشا ہاتھوں سے لکڑیوں کی چھال اُتارتا ہوا چوکی کی طرف مُنہ کر کے دھیمے سُر میں گانے لگا۔

"اُسے براتوں اور ڈولیوں سے کیا غرض۔
جسے بیکراں جدائی ملی ہو۔
ہم فقیروں کی یہی دُعا ہے کہ
پروردگار تیری مدد کرے۔

مکھے شاہ کی بیٹھک کے آگے ایک چارپائی پڑی تھی۔ جس پر چادر بچھا کر ایک شخص اس طرح بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے پرانے وقتوں میں کوئی مہنت گدی پر بیٹھا کرتا تھا۔ مکھے شاہ اس کے حضور ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور اس کے ملازم بھی۔

کیلی جب اسٹیشن سے اُتر کر وہاں پہنچی تو وہ بخشے سے چار قدم آگے تھی۔ بخشے کے ہاتھ میں تھوڑا سا سامان تھا۔ وہ کیلی سے ذرا پیچھے رہ گیا تھا۔ باہر کی ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی کیلی سمجھ گئی۔ کہ بیمہ کمپنی کا آدمی جانچ پڑتال کے لئے پہنچ چکا ہے۔ کیلی نے ایک سرسری نگاہ سے اس طرف دیکھا جہاں بیمہ کمپنی کا سرویئر چارپائی پر بیٹھا تھا اور باقی سب لوگ اردلی میں کھڑے تھے سب سے پہلے کیلی کی نظر مکھے شاہ پر پڑی اور اُسے محسوس ہوا کہ آج مکھے شاہ کی ریڑھ کی ہڈی کہیں سے جھک گئی تھی اور وہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر کیلی نے قریب کھڑے ہوئے آدمیوں پر نگاہ ڈالی۔ سب کے چہروں پر خوف کی جھلک تھی۔ آخر میں کیلی نے چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے

شخص کی طرف دیکھا۔ اُس کی گردن اُس کی کلاہ والی پگڑی کے طرّے کی طرح اکڑی ہوئی تھی اُس کی مسکراہٹ اُس کی بڑی بڑی مونچھوں سے گزر کر کیلی کی طرف یوں جھپٹ رہی تھی۔ جیسے کسی بچے کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹکڑا دیکھ کر کوئی اڑتی ہوئی چیل جھپٹتی ہے۔ کیلی نے گھبرا کر ایک بار پیچھے کی طرف دیکھا۔ بخشا ابھی چار قدم کے فاصلے پر تھا۔ پھر کیلی نے تیز تیز قدم اُٹھائے اور گھر کی دہلیز میں داخل ہوئی۔

اُس کے پیچھے آکر جب بخشے نے ہاتھوں سے ساری چیزیں نیچے رکھ دیں تو کیلی نے ہنس کر اُس سے کہا "شاہ کا واسطہ آج کسی بے ڈھب آدمی سے پڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیں کل کا دن کیسے نکلتا ہے"

"اگر تو کہے تو میں باہر جا کر دیکھوں کہ کیا ہو رہا ہے؟"

"جیسی تیری مرضی۔ اور شاہ سے پوچھتے آنا کہ اُسے اپنے مہمان کے لئے کیا پلاؤ بنوانا ہے تو ساری چیزیں تیار ہیں" یہ کہتے کہتے کیلی کو پھر اُس کلاہ والے شخص کی آنکھوں کی لپک اور جھپٹ یاد آئی اور اپنے آپ اُس کے ہاتھ اپنے دوپٹے کی جانب چلے گئے۔ دوپٹے کو اپنے اوپر پوری طرح لپیٹتے ہوئے کیلی کو یوں محسوس ہوا کہ وہ اس دوپٹے کے تحفظ میں اچھی طرح چھپ جائے گی۔

بخشا باہر چلا گیا۔ کیلی کتنی ہی دیر تک دہیں کی وہیں کھڑی رہی۔ پھر اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس کے پیروں سے اس کے سر تک ٹھنڈک کی ایک لہر چڑھ

رہی ہے۔ وہ کپکپا اٹھی اور چوکے کی طرف چلی گئی اور چولہے میں آگ جلانے لگی۔

مٹی بھر دال چڑھانے کے لیے جب کیلی نے اُٹھ کر پتیلا دھویا تو اُس کی نظر چولہے کے پیچھے پڑی اور اُس نے وہاں ایک ہنڈیا کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھا کہ اُس میں ساگ پکا ہوا ہے۔ "رات ہی پکا گئی ہوگی"، صبح ہی صبح کیلی نے سوچا اور پھر پتیلے میں پانی ڈال اُسے چولہے پر رکھ کر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

پہلے تو وہ کتنی ہی دیر تک بخشے کا انتظار کرتی رہی کہ وہ بھی آجائے لیکن جب چائے ٹھنڈی ہونے لگی تو وہ آگ پر ہاتھ تاپتی چائے پینے لگی۔

چوکے کے باہر بخشا جوتا اتارتا اندر آگیا اور کیلی کے سامنے مونڈھے پر بیٹھ کر کہنے لگا۔ "آدمی ذرا ٹیڑھا نظر آتا ہے۔"

کیلی نے پتیلے میں باقی چائے کو ایک بار پھر گرم کیا اور گلاس میں ڈال کر بخشے کو دیتے ہوئے بولی۔ "پیسہ کمانا اگر دشوار ہوتا ہے تو اُسے لوٹنا بھی تو آسان نہیں ہوتا۔"

"مجھے اس بات کی پرواہ نہیں مگر۔۔۔"

"چپ کیوں ہو گئے؟"

"بات ہی چپ ہو جانے والی ہے۔"

"کیا میرے سامنے بھی"

"میں اپنے منہ سے کیسے کہوں؟"

"کیا فرق پڑتا ہے بخشے۔ تو اپنی طرف سے کچھ تھوڑے ہی کہے گا۔ کیا وہ میرے متعلق کچھ کہتا تھا؟"

"ہاں کیلی۔ اُس نے مجھے شاید گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بس جب اُس کے پاس جا کر کھڑا ہوا تو وہ شاہ سے تیرے متعلق باتیں کر رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ اُس کی ہنسی بڑی بھیانک تھی۔"

"اور شاہ چپ چاپ سُنتا رہا؟ اُس نے اُسے روکا نہیں۔؟"

"آج اُس میں کسی کو روکنے کی ہمت نہیں۔ ورنہ اُس نے جو بات کہی تھی۔ آدمی وہ بات سن کر گنڈاسہ ہاتھ میں پکڑ لے اور وہ بات کہنے والے کو گھاس کی طرح کاٹ ڈالے۔"

"کیا کہا تھا اُس نے؟"

پہلے تو بخشا کچھ جھینپا اور پھر اُس نے دوسری طرف منہ کر کے ساری بات ایک ہی سانس میں کہہ دی "شاہ سے کہہ رہا تھا کہ تو نے یہ گڑیا کہاں سے اڑائی ہے۔"

کیلی کو ہنسی آگئی اور وہ کہنے لگی "میرا جی چاہتا ہے کہ کاش میں بھی اُس وقت وہاں ہوتی اور اپنی آنکھوں سے دیکھتی کہ شاہ کے چہرے پر کون سا رنگ آیا اور کون سا رنگ گیا۔"

"کوئی بھی رنگ نہ آیا کیلی۔ اُس نے تو کھسیانہ سا منہ بنا کر صرف اتنا کہا تھا۔

"حضور۔ میری بیوی ہے۔"

"پھر ۔۔۔؟"

"پھر کیا تھا اور بھی زور سے ہنسا اور کہنے لگا کہ سونے کی زنجیروں سے تو اُسے باندھ لایا ہوگا۔ ورنہ یہ تیرے یہاں آنے والی نہیں تھی۔"

"شاہ کے نوکر چاکر کیا پاس ہی کھڑے ہوئے تھے۔"

"سب کھڑے ہوئے تھے اور سُن رہے تھے۔"

"پھر تو وہ اور بھی کھُل کھیلا ہوگا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ اُس نے شاہ کی کمزوری کو بھانپ لیا ہے۔ پہلے وہ جلے ہوئے گودام کی طرف گیا اور راکھ کو ٹٹولتے ہوئے شاہ سے کہتا رہا۔ کہ اگر بیس ہزار روپے کا مال جلا ہے تو راکھ اتنی تھوڑی نہیں ہو سکتی۔"

"پھر ۔۔۔؟"

"جواب تو کوئی بن نہ سکا۔ شاہ صرف منمناتا رہا اور کہتا رہا۔ "حضور ان ملازموں سے پوچھ لیجیے۔ ان لوگوں نے اپنے ہاتھ سے مال گودام میں بھرا تھا۔"

"پھر ۔۔۔؟"

"پھر اُس نے کہا کتابیں دکھاؤ۔ تم نے کتنا مال خریدا اور کتنا بیچا۔؟"

"خاک خریدا اور خاک بکری۔"

"میرا خیال ہے کہ شاہ نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ اُس نے جب کتابیں دکھائیں تو اُن میں واقعی خریدا تنی ہی تھی اور بکری تھوڑی۔"

"پھر ــــ؟"

"وہ بھی شاید ایسے سارے داؤ پیچ جانتا تھا۔ کہنے لگا کہ ہو سکتا ہے کہ تم نے مال رسید کے بغیر بیچ دیا ہو اور ان کتابوں میں درج نہ کیا ہو۔"

"دونوں کا مقابلہ تو اچھا ہے۔"

"شاہ کا چہرہ بہت اُترا ہوا ہے۔ مال کی کوئی بات کرنے کی بجائے وہ بار بار اُس سے یہی کہتا رہا۔ "حضور، آپ تھک گئے ہوں گے۔ بیٹھ کر چائے پانی پی لیجئے۔"

"ہاں صبح۔ اُس کے لئے کچھ بنانا پکانا پڑے گا۔"

"اس وقت تو وہ بیٹھک میں بیٹھا پی رہا ہے۔ شاہ نے اس کے لئے شراب کی دو بوتلیں منگوائی ہیں اور ساتھ ہی بڑے بازار سے گوشت منگوایا ہے۔"

"اچھا بخشے تُو اب جا کر آرام کر۔ صبح کا تھک گیا ہوگا۔ ہاں روٹی تو کھا جا۔ ساگ پکا ہوا ہے۔ آگ جل رہی ہے۔ بس دو منٹوں میں گرم روٹی بنائے دیتی ہوں۔"

"نہیں مجھے کچھ نہیں کھانا کیلی۔ ویسے اگر تُو کہے تو میں ابھی نہیں جاتا۔

سے مجھے کچھ ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیسا ڈر ۔۔۔؟"

"ابھی ابھی وہ گوشت کی بوٹی دانتوں میں توڑتے ہوئے شاہ نے کہہ رہا تھا کہ ہم تیری خاطر تواضع کو اس وقت قبول کریں گے جب تو اپنی نتی کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھلائے گا۔"

"اچھا۔"

"میرا خیال ہے کہ شاہ ابھی آئے گا۔ اور تجھ سے روٹی پکانے کے لئے کہے گا۔ صرف روٹی تک بات ٹل جائے تو اچھا ہے۔"

"کیا تجھے کوئی اور بھی ڈر ہے؟"

"ڈر ہی لگ رہا ہے بات اصل میں یہ ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کی نبض پہچان لی ہے۔"

"اور سودا مجھ پر ٹوٹے گا۔؟"

نکھٹے کا چہرہ شرم اور غصّہ سے سُرخ ہو گیا۔ غصّہ اُسے شاہ پر آ رہا تھا۔ اور شرم اپنے آپ پر۔ کیونکہ اُس وقت وہ کیلی کی حفاظت کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"بڑا شاہ کہاں ہے۔؟" کیلی نے اچانک پوچھا۔

"کوڑے شاہ؟ وہ تو چلے ہوتے گودام کے قریب چارپائی بچھا کر ملا

پھیر رہا ہے جیسے جلی ہوئی کپاس سے کوئی دردان مانگ رہا ہو۔"

"اچھا بخشے۔ مجھ پر جو گزرے گی میں اُس سے نپٹ لوں گی تو اب جا۔ صبح آکے میری خیر خیریت پوچھ لینا۔"

"مجھے تو رات بھر چین نہیں آئے گا۔ اگر تُو کہتی ہے تو میں یہیں کہیں نزدیک ہی۔"

"یہاں قریب ہی رات کہاں کاٹے گا۔ یہاں تیرا رہنا ٹھیک بھی نہیں تو پہلے کبھی یہاں رہا نہیں اور اگر کوئی بات ہو بھی گئی تو سارا الزام تجھ پر آئے گا۔ تو مجھے اس سے نپٹنے دے۔"

"کیلی۔ میں کسی بات سے نہیں ڈرتا۔ اگر مجھ پہ الزام عائد ہوگا تو پھر کیا ہے؟"

"میں نے اس لئے نہیں کہا بخشے۔ مگر یہ سوچتی ہوں کہ تو اگر پاس ہوا تو سارا بھانڈا تیرے سر پر پھوٹے گا اور اگر کل شاہ کو بیمہ کا روپیہ نہ ملا تو وہ مجھے تیری شکل تک دیکھنے نہیں دے گا۔ میں تجھ سے ملنے سے بھی جاؤں گی۔"

"تُو بڑی دور اندیش ہے کیلی۔" اور بخشا اُٹھتے اُٹھتے پھر تشویش و پیچ میں پڑ گیا۔ "آج میرا دل نہیں مانتا کہ تجھے اکیلی چھوڑ جاؤں۔"

"میں تجھے اپنے قریب ہی سمجھوں گی۔ اور سوچوں گی کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔"

"اچھا کسی بات سے گھبرانا نہیں کیلی۔"

"تو صبح سویرے سے ہی کسی بہانے سے آجانا۔ چاہے ایک پل کے لئے سہی۔"

باہر کے آنگن میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور بخشا جلدی سے چوکے کے باہر آ کر اپنے جوتے پہننے لگا۔

"میں نے کہا۔ کہاں ہو،" لکھے شاہ کی آواز آئی اور وہ چوکے میں آتا ہوا بولا سالا آٹا گوندھا ہے کہ نہیں ابھی۔؟"

"ساگ بن گیا ہے۔ آٹا گوندھا ہے مہری تو آئی نہیں۔ میں روٹی بنائے دیتی ہوں۔" کیلی نے جواب دیا۔

"مہری آئی تھی۔ مگر میں نے اُسے باہر سے واپس بھیج دیا۔ میں نے سوچا تو خود ہی چار روٹیاں بنا لے گی۔"

کیلی نے چولہے پر توا رکھ دیا اور آٹا سنوارنے لگی۔

"تو روٹیاں بنا کر بیٹھک میں بھیج دے۔ میں باہر سے کسی آدمی کو بھیجتا ہوں اور لکھے شاہ مُڑتے مُڑتے کہنے لگا" اوپر کے چوبارہ میں سالی ایک کھاٹ بھی ڈال دینا۔"

کیلی کو صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں لکھے شاہ اس آدمی کو چوکے میں نہ لیے آئے۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ کیلی نے روٹیاں پکائیں اور ایک آدمی کے ہاتھ باہر بھیج دیں۔

رات کو چوکے کا کام سنبھال کر کیلی جب دودھ کا دہی جمانے کے لئے اسے "رکھنا" رکھانے لگی۔ تو لکھے شاہ نے کہا "زیادہ سے دودھ کا ایک گلاس رکھ لینا"

کیلی نے دودھ کا ایک بڑا گلاس بھرا۔ اس میں شکر ڈالی اور پھر اُس میں کچھ بالائی بھی ڈال دی۔ گلاس کیلی نے چولہے کی دھیمی آنچ کے قریب رکھ دیا اور باقی دودھ ہنڈیا میں ڈال کر اُسے "دکھنا" لگا دیا۔

رات کے آنگ کیلی کے انگوں کی طرح ٹھنڈے سے تھے اور ان میں کپکپی دوڑ رہی تھی۔ کیلی نے اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے لکھے شاہ سے کہا۔

"دودھ کا گلاس میں نے چولہے کے قریب رکھ دیا ہے۔"

"یہاں لے آ۔ میں اُسے چبارہ میں دے آؤں" لکھے شاہ نے جواب دیا۔

کیلی پھر چوکے میں گئی اور دودھ کا گلاس اُٹھا لائی۔

"ذرا چبارہ میں جا کر اُسے رکھ بھی آ۔ میں نے تو ابھی سالی ٹانگ سیدھی بھی نہیں کی ہے" لکھے شاہ نے سر پر کمبل اوڑھتے ہوئے کہا۔

"چوبارے میں" کیلی کی آواز کپکپا اُٹھی اور اُسے محسوس ہوا کہ اُسے ہاتھ میں پکڑے ہوئے دودھ کے گلاس سے شراب کی بُو آ رہی ہے۔

"اس سے کچھ اونچی نیچی بات نہ کہنا۔ اس وقت سالا سارا روپیہ اُس کی مٹھی میں ہے۔" لکھے شاہ نے کمبل کے اندر سے کہا۔

کیلی کو سر سے پاؤں تک غصّہ آ گیا اور اُس کا جی چاہا کہ دودھ کا گلاس وہ باہر کے دروازے کے قریب رکھ کر دروازے کی کنڈی کھولے اور جتنا تیز وہ دوڑ سکتی ہے۔ دوڑتی ہوئی کہیں چلی جائے۔

کیلی باہر کے دروازے تک جا پہنچی - اس کی کنڈی کھولنے کی بجائے بائیں طرف کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چوبارے کا دروازہ بند تھا لیکن اس کی درز میں سے اندر کی لالٹین کی روشنی ایک لمبے سانپ کی طرح باہر کے فرش پر پڑ رہی تھی کیلی نے روشنی کی اس لکیر پہ اپنا پیر اس طرح رکھا جیسے کوئی جان بوجھ کر اپنا پاؤں سانپ پر رکھ دے۔

چوبارے کا بند دروازہ کیلی کو کھولنا نہ پڑا۔ کسی نے خود ہی دروازہ کھول دیا۔ اور کیلی کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے لیا۔ کیلی واپس آنے لگی تو کسی نے پیچھے سے اُسے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا اور کیلی کی چیخ کو اپنے اوپر لئے ہوئے کمبل میں دبا کر اسے چوبارے کے اندر کھینچ کر لے گیا۔

کیلی کو چارپائی پہ گرا کر وہ چوبارے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اندر سے کنڈی لگانے لگا تھا کہ اُس وقت کیلی نے اُٹھ کر چارپائی کے قریب پڑی ہوئی شراب کی بوتل ہاتھ میں پکڑ لی اور سارا زور لگا کر اُس آدمی کے سر پہ دے ماری۔ کیلی کی چیخ کو کمبل کی لپیٹ نے زیادہ بلند نہیں ہونے دیا تھا۔ مگر اُس آدمی کی چیخ کو روکنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ اسٹول پہ پڑا ہوا دودھ کا گلاس نیچے گر گیا۔ خبر نہیں اُسے کیلی کا ہاتھ لگا یا اُس آدمی کا۔ سارا دودھ آنسوؤں کی طرح فرش پہ بہنے لگا۔

کیلی نے چوبارے کا دروازہ کھولا اور سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی۔ رات

کیلی کے غصہ کی طرح سیاہ ہو گئی تھی۔ کیلی نے دیکھا لکھے شاہ نیچے سیڑھیوں کے قریب کھڑا تھا۔ شاید اُس نے چوبارے میں سے آتی ہوئی چیخ سُن لی تھی۔

کیلی دروازے کی طرف بڑھی اور اُس نے کہا "میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں نہیں جانتی کہ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے۔"

لکھے شاہ نے غصہ میں آ کر کیلی کو بازو سے پکڑ لیا "اب سالی جاتی کہاں ہے؟ میں ابھی پولیس بُلاتا ہوں۔"

"چھوڑ دو میرا بازو۔" کیلی نے زور لگا کر اپنا بازو کھینچا اور کہا "اگر تو پولیس بُلائے گا تو خود پھنس جائے گا۔ میں سارا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔ گودام کو آگ لگانے والی بات بھی بتا دوں گی۔"

لکھے شاہ نے بدک کر اُس کا بازو چھوڑ دیا اور پھر وہ کانپتا اور ہانپتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

کیلی دروازہ کی کنڈی کھول رہی تھی۔ جب اُوپر کے چوبارے سے آواز آئی "بد حرامی۔ تُو تو کہتا تھا کہ بڑی امیل ہے وہ ۔ ۔ ۔ ۔"

کیلی نے ایک لمبا سانس لیا اور اس بات سے اس کے قدموں میں ہمت پیدا ہو گئی۔ وہ شخص مرا نہیں تھا۔ زندہ تھا۔

"سالی پاگل ہے حضور۔" پھر لکھے شاہ کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔ اور وہ جلدی سے کنڈی کھول کر دروازے کے باہر چلی گئی۔

کیلی ابھی ریلوے لائن تک نہیں پہنچی تھی کہ رات کے ہونٹوں میں سے آواز آئی "یہ کون ہے۔؟ بہن کیلی۔"

کیلی نے بخشے کی آواز پہچان لی اور پھر دائیں طرف سے بخشے کو کمبل لپیٹے آتا ہوا اُس نے دیکھ لیا۔ "تو کہاں سے آگیا؟" کیلی نے کہا اور جلدی سے دائیں طرف کو چل پڑی۔

بخشے نے کمبل اُتار کر کیلی کو اپنے بازو کا سہارا دیا اور کہا "میں نے تجھ سے کہا جو تھا کہ میں تیرے قریب ہی رہوں گا"

"میرا خیال نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی" کیلی نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے ڈر تھا" بخشے نے جواب دیا اور پھر کمبل کیلی کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے اس نے کہا "تو نے تو اوپر کوئی گرم کپڑا بھی نہیں لیا۔؟"

"کپڑا لینے کا وقت نہیں تھا" کیلی نے کہا۔

"کوئی تیرے پیچھے تو نہیں آرہا" بخشے نے کہا اور پھر پیچھے مُڑ کر دیکھا۔

"میرا خیال تو نہیں چونکہ میں اُنہیں یہ خوف دلا کر آئی ہوں کہ اگر کسی نے مجھ سے

کچھ کہا تو میں تھانے میں سارا بھید کھول دوں گی۔ اس بات سے دونوں ہی کانپتے ہیں،، کیلی نے اطمینان کے ساتھ کہا اور پھر بخشے سے پوچھنے لگی "تیری جیب میں کیا کچھ پیسے ہیں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے؟"

"پیسوں کی تو فکر نہ کر۔ میں کہیں سے بیس روپے پکڑ لایا تھا۔ اب یہ بتا کہ اب کیا کرنا ہے؟"

"مجھے لاہور جانے والی گاڑی میں بٹھا دے اور دیپک کا پتہ لکھ دے کسی کاغذ پر یا زبانی بتا دے۔"

"میں تجھے اکیلی نہیں جانے دوں گا کیلی یا تو میں تجھے خود جا کر چھوڑ آؤں گا۔ یا تو ایک دن میرے کمرے میں گزار لے میں دیپک کو جا کر لے آؤں گا۔"

"نہیں بخشے۔ وہ اگر یہاں آیا تو کوئی دیکھ لے گا اسے۔ تو مجھے ہی جانے دے۔،،

"چل پھر میں تجھے چھوڑ آتا ہوں۔ جو بھی گاڑی پہلے ملتی ہے اُسی میں سوار ہو جاتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تو میرے ساتھ نہ چل۔ کل صبح شاید وہ مجھے ڈھونڈنے لگیں۔ اور شہر میں ایک تو ہی ہے۔ جہاں وہ مجھے سب سے پہلے دیکھنے جائیں گے۔"

"میں چاہے اُلٹے پاؤں لوٹ آؤں۔ لیکن تیرے ساتھ ضرور جاؤں گا۔،،

"کل دوپہر تک لوٹ آؤں گا اور کسی کو شک نہیں ہوگا۔"

"اس وقت ہمیں گاڑی کون سی ملے گی؟"

"گاڑی تو صبح سے پہلے کوئی جاتی نہیں۔"

"میں صبح گاڑی پر سوار ہوتی تو کوئی نہ کوئی مجھے ضرور دیکھ لے گا۔ ویسے اگر اب کوئی دیکھ بھی لے تو میں ڈرتی نہیں ہوں۔ میں عدالت میں سب کچھ بتا سکتی ہوں اور میں اپنی جگہ سچی ہوں مگر بات بہت لمبی ہو جائے گی۔"

"پھر ——؟"

"تو ہی کوئی حل سوچ۔"

"ایک بات ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا ——؟"

"یہاں سے موٹروں کے اڈہ کی طرف چلتے ہیں۔ رات کو یہاں سے مال کے ٹرک جاتے ہیں۔۔۔۔"

"مگر وہ سواریاں تو نہیں بٹھلاتے۔"

"کئی بار زیادہ روپے لے کر بٹھا بھی لیتے ہیں۔"

"لیکن اس طرح کیا انہیں کوئی شک نہیں گزرے گا۔؟"

"کوئی بات بنا لیں گے۔"

"تو اُن سے کہہ دینا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے اور ہمیں راتوں

رات وہاں پہنچنا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ میں یہ کہوں گی کہ اس کا باپ سخت بیمار ہے اگر ہم لاتوں رات وہاں پہنچ جائیں تو اس کا منہ دیکھ لیں گے۔"

"تیزی یہ بات ٹھیک ہے۔"

"تو سر کا دوپٹہ ذرا نیچے کر لینا اور تھوڑی تھوڑی روتی رہنا۔ اس طرح کسی کو شک نہیں ہو گا اور کوئی تجھے پہچانے گا بھی نہیں۔"

"لیکن وہ سوچیں گے اس نے بھائی سے گھونگھٹ کیوں کر رکھا ہے۔ چل مگر تو مجھے وہاں اپنی بہن نہ کہنا۔ اپنی بیوی بتا دینا۔ لیکن بیوی بھی تو اپنے خاوند سے گھونگھٹ نہیں کرتی جب اکیلی ہو۔"

"چلو۔ کچھ دیر کے لئے میں تیرا بھائی نہیں بنوں گا۔ دیپ کا بھائی بن جاؤں گا۔ کہوں گا کہ میری چھوٹی بھابی ہے۔ بھائی میرا باہر گیا ہوا ہے۔ جب خبر آئی.....۔"

کیلی کے منہ پر کسی خطرے کی دھول اُڑ اُڑ کر پڑ رہی تھی۔ لیکن بخشے کے منہ سے بھابی کا لفظ سُن کر اور وہ بھی دیپ کے سلسلہ میں کیلی کا چہرہ چمک اُٹھا۔ لاریوں کے اڈے کے قریب پہنچ کر کیلی نے سر کا دوپٹہ نیچے کر لیا اور بخشے نے ایک ٹرک والے سے بات کر کے چار روپے اُس کی مٹھی میں دیتے ہوئے کیلی سے بلند آواز میں کہا "اب ذرا دھیرج رکھ بھابی۔ ہم ایک گھنٹہ میں پہنچ جائیں۔

گے۔ تو باپو کی خیریت مانگ۔ رو تی کیوں ہے۔؟

ٹرک والے آہستہ آہستہ ٹرک میں سامان لادنے لگے۔ اور کیلی ایک طرف بنچ پہ بیٹھ کر کل کے خواب پر غور کرنے لگی۔ کل خواب میں باپو نے میرے اور مترو کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔" روؤ نہیں۔ تمہیں ابھی بہت دُور جانا ہے۔ اُٹھو ہمت کرو۔" اور آج ہی مجھے جانا پڑ گیا۔"

اور پھر کیلی اپنی بات سوچتے سوچتے مترو کی بات سوچنے لگی۔ خبر نہیں اُسے اب کہاں جانا پڑے گا۔"

دیپک کا دروازہ جیسے کیلی نے اور سورج کی پہلی کرن نے ایک ساتھ کھٹکھٹایا۔ ایک لمحہ کے لئے دیپک کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا کر دُنیا کی اس روشنی کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ بخشا ہنستے ہوتے کھانسا۔ یہ کھانسی کچھ اس طرح تھی جیسے اپنے ہاتھ سے اُس نے دونوں کے سر پہ پیار دیا ہو۔

اندر آکر دیپک نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوتے کہا "میں اب پھر دروازہ نہیں کھولوں گا۔ کم سے کم تیرے جانے کے لئے تو نہیں کھولوں گا۔"

"کیا یہ مرد کی زبان سے کہہ رہے ہو" کیلی نے ایک عورت کی طرح التجا کرتے ہوتے کہا۔

"ہاں ایک مرد کی زبان سے" دیپک نے ایک مرد کی آواز میں جواب دیا۔

"ایک دن تم نے کہا تھا" کیلی نے چارپائی پہ بیٹھتے ہوتے کہا۔ "کہ جنگلے حفاظت بھی کرتے ہیں اور قید بھی کرتے ہیں۔ جب یہ حفاظت کرتے ہیں تو ان کی خیریت طلب کی جاتی ہے اور جب یہ قید کرتے ہیں تو انہیں توڑنا بھی پڑتا ہے۔"

"اور تو میرے مُنہ سے جنگلہ توڑنے کی بات سُن کر ڈر گئی تھی اور میں نے کہا تھا مت ڈرو نہیں کیلی۔ جب تک یہ جنگلے تیری حفاظت کریں گے۔ میں ان کی بھلائی چاہوں گا۔"

"اب وہ جنگلہ میری حفاظت نہیں کر سکتا تھا اس لئے میں راتوں رات اُسے پار کر کے چلی آئی ہوں۔"

"تجھے بہت تکلیف ہوئی ہو گی کیلی۔ تو نے مجھے آواز کیوں نہ دی؟"

"مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے تم نے دوسری طرف سے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہو اور پھر بخشا تو میرے ساتھ تھا ہی۔"

دیپک نے بخشے کے کندھے پر رکھا ہوا ہاتھ زور سے دبایا۔

"تو کیلی کو میرے سپرد کر آیا تھا"، بخشے نے کہا اور اس نے دیپک کا بازو پکڑ کر اُسے بھی چارپائی پر بٹھا لیا۔

"تو نے واقعی میرے ہاتھ میں دوست والا ہاتھ دیا تھا"، دیپک نے کہا اور بخشے کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر چائے بنانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تو اس وقت چائے رہنے دے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اُلٹے پاؤں لوٹ جانا چاہیئے"، بخشے نے کہا اور چارپائی پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے پاس بجلی کا چولہا ہے اور رات کا دودھ بھی بچا ہوا ہے۔ تجھے

دودھ لانے نہیں جانا پڑے گا۔ بس دو منٹ لگیں گے۔"

"شاید اس وقت دو منٹوں سے بھی کچھ نقصان ہو جاتے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اس وقت تک واپس بھی پہنچ جاؤں گا۔ ہم تو رات کو ایک یا دو بجے ہی پہنچ جاتے لیکن ٹرک والوں نے سامان لادنے میں آدھی رات کر دی۔ ہم نے رات یہاں اسٹیشن پہ بتائی ہے۔ مسافر خانے میں مجھے ڈر تھا کہ آدمی رات کو تمہارا گھر ہمیں نہیں ملے گا اور یہ بھی سنا تھا کہ شہر میں کچھ گڑبڑ ہے۔" بخشے نے جلدی جلدی کہا اور پھر دیپک کے پاس جا کر ایک منٹ کے لئے کھڑا ہو گیا۔ "اُس دن تو نے مجھ سے دوست والا ہاتھ طلب کیا تھا" بخشے نے کمبل سے ہاتھ نکال کر دیپک کی طرف بڑھایا اور بولا "آج میں تجھ سے دوست والا ہاتھ طلب کرتا ہوں۔ چاہے کتنے ہی طوفان کیوں نہ اُمڈ آئیں تجھے میری بہن کا ہاتھ نہیں چھوڑنا ہوگا"

دیپک نے اپنا ہاتھ بخشے کے ہاتھ میں دے دیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسوؤں نے جیسے آنسوؤں سے عہد و پیمان کر لیا۔

"جو بھی اچھی یا بڑی خبر ہو گی اُس کی اطلاع دے دینا اور گاؤں میں میری ماں" کیلی نے اُٹھ کر کہا۔

"میں تجھے خط لکھ کر سب کچھ بتا دوں گا اور اگر وہاں سکون ہوا تو کبھی کبھی آ کر تجھ سے مل بھی جایا کروں گا" بخشے نے ایک باپ کی طرح اور ایک ماں کی طرح کیلی کے سر پہ پیار دیا۔

"ایک منٹ ٹھہر جا بخشے۔" دیپک نے کہا اور جلدی جلدی ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر وہ کاغذ بخشے کو دے دیا۔ "میں شاید کیلی کے ساتھ یہاں نہ رہوں۔ میرے کام کی بات دِلّی میں بن رہی ہے۔ تو یہ پتہ بھی اپنے پاس رکھ لے۔"

بخشے نے کاغذ جیب میں ڈال لیا اور کمرے کے باہر چلا گیا۔

دروازے کی چٹخنی لگا کر دیپک نے کیلی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ایک روز تو مجھے مل جائے گی۔ مگر یہ خبر نہیں تھی کہ تو اس قدر جلد مل جائے گی۔"

"تم نے مجھ سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہاں کیا ہوا۔" کیلی نے کہا اور اس کی آنکھوں کے آگے شاہ کے چوبارے کا وہ منظر آگیا۔ جہاں گلاس سے گرا ہوا دودھ بہہ رہا تھا۔ اگرچہ اندھیرے میں کیلی نے خون نہیں دیکھا تھا پھر بھی کل رات سے اُسے یہ کئی بار محسوس ہوا تھا کہ اس کے پیر کے نیچے چپچپاہٹ ہو رہی ہے۔ جس میں دودھ کی بوندیں بھی شامل تھیں۔ شراب کے قطرے بھی شامل تھے۔ اور خون کی بوندیں بھی۔ اگرچہ کیلی نے اپنے پیروں کی طرف رات کو کئی بار دیکھا تھا۔ پھر بھی کیلی کا دھیان اپنے پیروں کی طرف چلا گیا۔

"جو کچھ بھی ہوا۔ اچھا ہی ہوا۔ اور اب جو کچھ ہوگا میں اسے برداشت کر لوں گا۔" دیپک نے کہا اور پھر کمرے کی الماری کھول کر وہ کچھ ڈھونڈھنے لگا۔

• الماری کے قریب سے ہٹ کر جس وقت دیپک کیلی کے قریب آیا تو اس کے ہاتھ میں سونے کا وہ کنگن تھا جو کبھی کیلی نے اسٹیشن پر آکر اُسے دیا تھا۔

"ہاتھ بڑھاؤ۔"

"یہ کیا۔؟"

"میں نے اُسے آج کے دن کے لئے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔"

"تم نے اسے بیچا نہیں تھا۔؟"

"یہ تو میرے انتظار کی علامت تھا۔ اسے کس طرح بیچ سکتا تھا۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ یہ دن آئے گا۔؟"

"یہ تو مجھے معلوم تھا کہ آئے گا۔ مگر میں نے سوچا تھا کہ مجھے کافی برسوں تک انتظار کرنا ہوگا۔"

"کیا تم انتظار کرتے رہتے۔؟"

"جب تک زندہ رہتا۔ انتظار کرتا۔"

دیپک نے کیلی کے ہاتھ میں سونے کا کنگن پہنا دیا اور پھر دیپک نے سر سے پاؤں تک کیلی کے انگ انگ کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ کیلی کو محسوس ہوا کہ آج دیپک نے کیلی کے میلے انگوں کو مَل مَل کر دھو دیا ہے۔ کیلی سرتاپا دو ہونٹوں کی ندی میں نہا گئی۔

کیلی نے ایک ایک کر کے اپنے بدن کے کپڑے اُتار دئے اس طرح جیسے

اُس نے وہ سب کچھ اُتار دیا جو دُنیا نے اُسے زبردستی پہنایا تھا اور اُس نے اپنے بدن کو اپنی روح کی طرح سب باتوں سے نجات دلا کر دیپک کے حوالے کر دیا۔

دیپک نے اپنی عریانی سے کیلی کی عریانی کو ڈھانپ لیا۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے سورج کی روشنی اندر آئی اور آہستہ آہستہ چارپائی کے پائے کو پکڑ کر اُٹھتی ہوئی کیلی کی کوکھ میں جا گری۔

دیپک کے پاس نیلے رنگ کی دھوتی تھی جو کیلی نے باندھ لی تھی اور گلے میں دیپک کی ایک سفید قمیض پہن لی تھی۔ کیلی نے جو کپڑے ایک بار اپنے گلے سے اُتارے تھے اگرچہ وہ شاہ کے گھر کے نہیں تھے اس کی ماں کے گھر کے تھے پھر بھی اُس نے وہ کپڑے دوبارہ اپنے بدن سے نہ لگائے۔

اُسی دن دوپہر کو دیپک نے کیلی کے لئے کچھ کپڑے خریدے تھے اور اُنہیں درزی کو دے آیا تھا لیکن درزی نے سلائی میں تین دن لگا دیئے تھے۔ تین دن سے کیلی نے وہی دھوتی باندھی ہوئی تھی اور گلے میں وہی قمیض پہنی ہوئی۔ ایک دوپٹہ دیپک نے اُس کو اُسی دن لے دیا تھا۔

دیپک درزی کے یہاں کپڑے لانے کے لئے گیا ہوا تھا جس وقت نیچے کے کرایہ دار کے ایک لڑکے نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کیلی کو ایک چھٹی دی۔

"یوں لگتا ہے کہ چھٹی نخشے کی ہے"، کیلی نے سوچا مگر چھٹی کھولی نہیں۔

دیپک جب کپڑے لے کر آیا تو آتے ہی کہنے لگا "ایک خوشخبری لایا ہوں میرا دلّی میں کام بن گیا ہے۔ اگر تو چاہے تو آج رات کی گاڑی ہی

سے چلے جائیں۔"

"یہ خبر تو بہت اچھی ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ اس میں سے کیسی خبر نکلے؟"
کیلی نے ہاتھ کی چھٹی دیپک کو دے دی۔

"چھٹی میں پیچھے پڑھوں گا پہلے مجھے ایک چیز دو۔"

"کیا ہے؟"

"جس طرح تو نے اپنی جان میرے حوالے کر دی ہے اسی طرح جان کی فکر و تشویش بھی میرے حوالے کر دے۔"

"میں تو پہلے ہی ایسا کر چکی ہوں دیپ"

"پوری طرح کر دے۔" دیپک نے ہاتھ سے کیلی کا منہ اپنی طرف کیا اور کہا "ان ہونٹوں کی طرح"

"اچھا میں روٹی لاتی ہوں۔ تم چھٹی پڑھو۔ اگر تم بتانا چاہو تو مجھے بتا دینا ورنہ نہ سہی" کیلی ہنس پڑی۔

"نہیں۔ نہیں۔ روٹی پیچھے لانا۔ پہلے مجھے یہ کپڑے پہن کر دکھاؤ" دیپک نے ہاتھ میں پکڑا ہوا بنڈل کیلی کو دے دیا۔

کیلی رسوئی میں چلی گئی۔ دیپک جس مکان میں رہتا تھا۔ وہ "اٹھائی چھتہ" مکان تھا۔ نیچے اور کوئی کرایہ دار تھا۔ اس کے اوپر کوئی اور۔ سب سے اوپر کی برساتی دیپک نے کرایہ پہ لے رکھی تھی۔ سارے مکان میں صرف ایک ہی

غسل خانہ تھا جو سب سے نچلی چھت پر تھا اور وہ سب کرایہ داروں کا سانجھا تھا۔ دیپک نے کبھی اُس غسل خانہ کا استعمال نہیں کیا تھا۔ اس لئے ایک کہار لگایا ہوا تھا۔ جو نچلی چھت سے پانی بھر کر اوپر دے جایا کرتا تھا۔ برساتی کے باہر کی طرف ٹین کی چھت ڈال کر دیپک نے ایک اور چھوٹا سا کمرہ بنالیا تھا۔ اُسے وہ رسوئی اور غسل خانہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

کیلی جب کپڑے بدل کر اور ہاتھ میں روٹی کی تھالی لے کر کمرے میں آئی تو دیپک چھٹی ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہنس رہا تھا۔ ”بخشے نے لکھا ہے کہ آج صبح میں لکھے شاہ کی طرف گیا تھا۔ یوں ہی۔ جیسے پہلے کبھی بہن کی خیریت پوچھنے جایا کرتا تھا۔ شاہ نے بڑے افسوس سے مجھے بتایا کہ پرسوں صبح کیلی اُس کے سامنے ہی کھیتوں کی طرف ساگ سبزی لانے گئی تھی۔ پڑوس کے گاؤں کے لوگ پہلے ہی گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کیلی کا منہ اور سر باندھ دیا اور اُسے ایک گھوڑے پر ڈال کر لے گئے۔ ابھی تک اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ مجھے اُس نے یقین دلایا کہ اُس کے ایک نوکر نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اُس نے پولیس اُن لوگوں کے پیچھے لگا دی ہے۔ اُسے بھروسہ تھا کہ کیلی مل جائے گی اور وہ اپنی آسامیوں سے مقدمہ بھی جیت جائے گا۔ جن لوگوں پر لکھے شاہ نے الزام لگایا ہے ان سے اس کی کافی عرصہ سے مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔“

دیپک نے ہنستے ہنستے آگے خط پڑھا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ بیمہ والی بات بھی بن جائے گی۔ شاہ نے بتایا کہ جو آدمی جانچ پڑتال کرنے آیا تھا اُس نے رپورٹ ٹھیک لکھی ہے۔"

کیلی روٹی کی تھالی ابھی تک ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھی۔ تھالی کو چارپائی پر رکھتے ہوئے اُس نے کہا، "یہ بھی دُنیا کا عجیب قاعدہ ہے۔ جب مجھے اغوا کیا گیا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ اپنے گھر گئی ہوں اور اب جب کہ میں سچ مچ اپنے گھر آ گئی ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے۔"

کالے پھولوں والی چھینٹ کی قمیض کیلی کے گلے میں بڑی کھل رہی تھی۔ دیپک نے چھٹی ایک طرف رکھ کر کیلی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

چارپائی پر بیٹھ کر روٹی کا پہلا نوالہ توڑتے ہوئے کہنے لگا، "تو نے ساری چھٹی تو سنی ہی نہیں۔ بخشتے نے آگے لکھا ہے کہ لکھے شاہ کیلی کی ماں کو بھی یہ خبر دینا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ کچھ دن ٹھہر جائے۔ شاید کیلی کا کچھ پتہ چل جائے۔ اُس کی ماں کو ابھی اطلاع نہ دو۔ وہ تو غم کے مارے مر جائے گی۔ لکھے شاہ کو میری بات پسند آ گئی۔"

"مجھے ماں کی فکر تھی۔ چلو۔ یہ بلا بھی ابھی ٹل گئی۔" کیلی نے اطمینان سے کہا اور روٹی کھانے لگی۔

"اور بخشتے نے تجھے پیار بھیجا ہے اور لکھا ہے کہ جب میں نے بہن سے

یہ بات کہی تھی کہ شاہ کی جانب سے یہ منت مان لے کہ جس دن شاہ کو بیمہ کا روپیہ مل جائے گا۔ تو وہ بہن کو گوردوارے کی عینٹ چڑھا دے گا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ منت اتنی جلدی پوری ہو جائے گی۔"

کیلی ہنستی ہنستی چارپائی پر سے اُٹھی اور چارپائی کے پایہ کے پاس بیٹھ کر اُس نے اپنا سر دیپک کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور کہا "سچ۔ کسی وقت کی کہی ہوئی بات خدا بہت نزدیک ہو کر سن لیتا ہے۔"

کیلی اور دیپک کو دلی آئے ہوئے پانچ مہینے ہو گئے تھے۔ پہلے پہل تو کیلی سوچا کرتی تھی کہ کسی کو اُس کا پتہ نہ چلے اور زندگی کے دن جس طرح گذر رہے تھے۔ اسی طرح گذر جائیں اور پھر جیسے جیسے دیپک اخباروں میں خبریں پڑھتا اور کیلی کو دنگے فساد کی خبریں سناتا تو کیلی اس بات کو ترس جاتی کہ اُسے کسی کی کوئی خبر تو ملے۔ یہ ۱۹۴۷ء کا سال تھا۔

"اگر بخشا زندہ ہوتا تو ضرور آتا" کیلی بار بار سوچتی "اپنی خبر بھیجتا۔ میری ماں کی خبر بھیجتا۔ متروکی خبر بھیجتا۔ نہ جانے وہاں کیا ہوا اور کیا نہ ہوا"

ابھی تک اگر کوئی خبر ملی تھی تو وہ دیپک کی ماں اور دیپک کے بھائی کی خبر ملی تھی۔ وہ کسی طرح بچ کر امرتسر پہنچ گئے تھے۔ جہاں سے دیپک کو اپنے بھائی کا خط آیا تھا اور دیپک وہاں جا کر اُن سے مل بھی آیا تھا۔ دیپک انہیں اپنے پاس لانا چاہتا تھا۔ مگر اُس کے بھائی کو اُمید تھی کہ وہاں رہنے سے سرکار کی جانب سے زمین مل جائے گی۔ دیپک نے اپنی ماں کو صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ اُس نے بیاہ کر لیا ہے اور کیلی کے متعلق اُس نے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا تھا۔ ماں نے

دیپک کے ہاتھ کیلی کو سوسو آشیرواد بھیجی تھی۔ اپنے آنے کے بارے میں صرف یہی کہا تھا۔ کہ جب بھی ذرا امن چین ہو جائے گا۔ وہ کیلی کو دیکھنے کے لئے آئے گی۔

ایک دن ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ کیلی نے حیران ہو کر دیکھا کہ دیپک وقت سے پہلے ہی گھر آگیا ہے۔

"ماں آئی ہے کیلی۔" دیپک نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کیلی نے کھڑکی میں سے باہر کھڑے تانگے کی طرف دیکھ کر سوچا کہ دیپک کی ماں آئی ہے۔

"اُس کے ساتھ بخشا بھی آیا ہے۔"

کیلی نے جب دیپک کو یہ کہتے سنا تو اُسے پتہ چلا کہ اُس کی اپنی ماں آئی ہے اور اُس کے ساتھ بخشا بھی آیا ہے۔

"بخشے کے پاس گھر کا پتہ نہیں تھا۔ ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا دفتر آگیا" دیپک نے بتایا۔

"سچ" کیلی کا انگ انگ پھڑک اُٹھا۔ اُن دنوں کسی بچھڑے ہوئے کا ملنا سب کے لئے ایسا تھا۔ جیسے یہ ملاقات اُس دنیا میں نہ ہو رہی ہو کسی اگلی دنیا میں ہو رہی ہو۔ پھر کیلی کے لئے یہ ملاقات تو اور بھی بیش بہا تھی۔

ماں نے جس طرح کیلی کو گلے سے لگایا شاید عمر بھر اس طرح کبھی نہیں لگایا تھا۔ بار بار اُس کا سر چومتی۔ روتی اور کہتی "اری میں تو خوش نصیب ہوں کہ اپنی بیٹی کا منہ دیکھ لیا۔"

کیلی ماں سے مل کر بخشے کی طرف آئی اور اس نے بڑے پیار سے اُس سے ملتے ہوئے کہا" ارے تُو نے تو مجھے بھلا ہی دیا بخشے" اور پھر جب کیلی نے غور سے بخشے کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ حیران ہو گئی" تجھے کیا ہو گیا ہے۔ بخشے۔ تُو تو سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔"

اندر آکر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بخشے نے جیب میں سے رومال نکالا۔ اور اپنی آنکھیں پونچھ کر کہنے لگا" میں نے تو سوچا تھا کہ میرے اندر سب کچھ سوکھ گیا ہے۔ آنسو بھی سوکھ گئے ہیں۔ لیکن تجھے دیکھ کر آج پھر کہیں سے آگئے ہیں"

"متر و تو زندہ ہے؟" بخشے کے آنسو دیکھ کر کیلی کو بھی خیال آیا اور اُس نے پوچھ لیا۔ اُسے یہ بھول گیا کہ یہ بات اُسے اپنی ماں کے سامنے پوچھنی چاہیئے تھی یا نہیں۔

"بڑا ظلم ہوا کیلی" بخشے کی جگہ ماں نے جواب دیا۔

کیلی سے بولا نہ گیا وہ صرف ماں کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

"باقی سب بچ گئے۔ صرف ایک مترو ہی کو دھرتی نے اپنے منہ میں ڈال لیا" ماں نے اپنی دونوں ہتھیلیاں ملتے ہوئے کہا" اس سے تو وہ آنکھوں کے سامنے مرجاتی تو اچھا تھا۔ چار دن رو لیتے اور تسلی آجاتی۔"

کیلی بات سمجھ گئی اور اُس نے کانپتے ہوئے سر جھکا لیا۔ دیپک نے بخشے کو بازو سے پکڑ کر اُٹھایا۔ اور منہ ہاتھ دُھلانے کے لئے غسل خانہ کی طرف لے گیا۔

"مترد کی ماں تو رو رو کر پاگل ہو گئی ہے۔ میرے ساتھ ہی فوجی ٹرک میں آئی ہے وہ تو آتی ہی نہیں تھی۔ فوجی اُسے زبردستی لے آتے۔"

ماں یہ کہہ رہی تھی کہ اُس نے دیکھا کہ کیلی کے چہرے کا رنگ سفید پڑتا جا رہا ہے۔ دیپک کمرے میں آیا اور ماں سے آہستہ سے کہا۔ "اس وقت اس کی اور باتیں نہ کرو۔ کیلی کے دل کو کچھ ہو جائے گا۔ ان دنوں۔ ۔ ۔ ۔"

ماں نے کیلی کو آہستہ سے چارپائی پر لٹا دیا۔ کیلی کا ماتھا پسینہ میں شرابور ہوا جا رہا تھا۔ ماں نے دوپٹہ کے پلّو سے اس کا ماتھا پونچھا اور پھر دھیرے دھیرے اس کے بازو دبانے لگی۔ بختا منہ ہاتھ دھو کر اور چارپائی کے بانس پہ بیٹھتا ہوا کیلی سے کہنے لگا۔ "تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ کیلی میری طرف دیکھ۔ میں تو پتھر ہو گیا ہوں۔ اب تو مجھے رونا بھی نہیں آتا۔"

دیپک ماں کو رسوئی میں لے گیا اور جہاں جہاں چیزیں پڑی تھیں ان کا پتہ بتلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "ماں تمہیں تو پہلے ہی آ جانا چاہیئے تھا۔ تم وہاں کیوں پڑی ہوئی تھیں؟ میں نے بختے کو کئی خط لکھے تمہارے لیئے۔ مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آتا تھا۔"

ماں کے رکے ہوئے آنسو چل پڑے کتنے ہی بہہ چکے تھے مگر ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ وہ روتے روتے دیپک کا سر چومنے لگی۔

"مجھے تیری چٹھیاں دکھائی تھیں بختے نے۔ لیکن میری ہی عقل ماری

گئی۔"

"تم کیلی سے ناراض ہو گی اور سوچتی ہو گی کہ اب تم اپنی بیٹی سے ہرگز نہیں ملو گی۔"

"سوچا تو بیٹا یہی تھا۔ تجھ سے سچ کہتی ہوں لیکن اپنے ہاتھوں اپنی آنتیں نہیں کٹ سکتیں"، ماں رسوئی میں آگ جلا کر چائے بنانے لگی اور دیپک کمرے میں واپس آگیا۔

"بخشے تو نے کوئی خط کیوں نہیں لکھا۔؟"، دیپک نے بخشے کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ بھی تھا خط تو لکھتا۔"

"میں کیا خط لکھتا دیپک۔ کیلی کی بات میں نے اندر بیٹھ کر ماں کو سچ سچ بتا دی تھی۔ لیکن ماں کا غصہ قابو ہی میں نہیں آتا تھا۔ کہتی تھی کہ اب میں کیلی کا منہ نہیں دیکھوں گی۔ پھر میں ماں کے متعلق تمہیں کیا لکھتا اور وہ دوسری بات۔ وہ بھی کوئی لکھنے والی بات تھی۔"

"پھر ماں یہاں آنے کے لئے کیسے مان گئی۔؟" کیلی نے دھیرے سے پوچھا۔

"ایک تو اس نے کسی سے یہ سنا تھا کہ لکھے شاہ اپنے گاؤں سے بہت سارا روپیہ اور بہت سا زیور اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ جن لوگوں کے زیور اس کے پاس رہن تھے انہیں خبر ہو گئی اور انہوں نے اس کا پیچھا کر کے سارا روپیہ پیسہ چھین لیا اور اسے بھی جان سے مار ڈالا۔"

"کیا یہ خبر سچی ہے؟" دیپک نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر ایسا سننے میں آیا ہے اور بات سچ معلوم ہوتی ہے۔ وہ تو پیسے کا غلام تھا۔ تمہیں معلوم ہے۔ کیلی جب آئی تھی تو اُسے بتا کر آئی تھی۔ لیکن اُس نے دوسرے ہی دن ایک نئی کہانی گھڑلی تھی۔ صرف اس لئے کہ جن لوگوں کے ساتھ اُس کا مقدمہ چل رہا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ یہ بات اُن کے سر منڈھ دے گا تو شاید مقدمہ جیت جائے گا۔ اُس نے ایک عینی شاہد بھی تیار کر لیا تھا۔"

"کیا وہ مقدمہ جیت گیا تھا؟"

"مقدمے کا تو مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اُسے بیمہ والا روپیہ مل گیا تھا۔ ویسے کہتے ہیں کہ جانچ پڑتال کرنے والا بھی اُس روپے میں سے کچھ روپیہ ہضم کر گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنے اندھے باپ کو وہیں چھوڑ گیا تھا۔ کیونکہ بھاگتے وقت اُسے ساتھ لے کر بھاگا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ لوگ تو پیسے کے غلام ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔ تو ماں کی بات کر رہا تھا۔"

"یہ بات سُن کر ماں کا دل کیلی کے سلسلہ میں بدل گیا تھا۔ لیکن دراصل اُس کا دل اُس وقت بدلا تھا۔ جب وہ مترو کی ماں کو روتا اور بلکتا ہوا دیکھتی تھی۔ اُدھر مترو کے سسرال والے کہتے تھے کہ اب اُسے ڈھونڈھنے سے

کیا فائدہ ۔ اب وہ مل بھی جائے تو کس کام کی ۔ وہ اسے اپنے گھر نہیں رکھیں گے ۔
لیکن متر و کی ماں اُسے پھر بھی ڈھونڈھتی پھرتی تھی اور کہتی تھی" کوئی بات نہیں ۔ تم گھر نہیں رکھو گے تو نہ رکھنا ۔ میں اُسے اپنے کلیجہ سے لگا کر رکھوں گی ۔ وہ تو اب بھی جہاں کہیں اُسے پتہ چلتا ہے کہ پولیس چند لڑکیاں ڈھونڈھ کر لائی ہے ۔ وہاں پہنچ جاتی ہے ۔ اور اُسے ڈھونڈھتی رہتی ہے ۔"

" آج کل کہاں ہے ؟"

" اس وقت جالندھر میں ہے ۔"

" پھر ماں نے اپنے آپ ہی تجھ سے کہا کہ اُسے دلّی لے چل کہ زبردستی اُسے لے آیا ؟"

" اب تو وہ میرے گھٹنوں کے ہاتھ لگاتی تھی ۔ کہ میں جیسے بھی ہو اُسے بیٹی سے ملا دوں ۔ رات کو سوئی ہوئی بھی بڑبڑاتی تھی اور کیلی کا نام لے لے کر آواز دیتی تھی ۔"

" تو بہت پریشان ہوا ہے بخشے ۔ اب میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گی ۔"

" میں ابھی یہاں کچھ روز رہوں گا ۔ پتہ چلا ہے کہ فوج دلّی . . . . بہت سی لڑکیاں ڈھونڈھ کر لائی ہے ۔ دیکھوں گا کہیں جا کر ۔"

" بخشے ۔" کیلی نے تکیہ سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے کہا ۔

" ہاں ۔"

"اگر متر و مل گئی تو۔"

"پھر ۔۔۔؟"

"تو اُس سے سسرال والوں جیسا سلوک تو نہیں کرے گا؟"

کبلی کے منہ سے یہ بات سن کر بخشا رونے لگا اور وہ کہنے لگا۔" اور تو کوئی مجھ سے یہ بات پوچھے بھی مگر تو مجھ سے یہ بات پوچھتی ہے۔"

آفتاب ابھی طلوع نہیں ہوتا تھا کہ بخشا گھر سے نکل جاتا اور جب آفتاب غروب ہو جاتا تو گھر لوٹ آتا۔ کیلی اُسے صبح سویرے چائے بنا دیتی اور دو تین نمکین روٹیاں پکا کر ایک کپڑے میں باندھ کر اُسے دے دیتی۔ ہر روز سورج بخشے کو سرکاری دفتروں کے آگے گھومتا ہوا دیکھا کرتا تھا۔

"بس میں صرف کل کا دن اور یہاں دیکھوں گا اور پھر ایک بار پنجاب جاؤں گا۔" ایک دن بخشے نے انتہائی مایوس ہو کر کہا۔

"تو پہلے بھی تو کافی دیر تک وہاں رہ چکا ہے۔ تو نے وہاں بھی تو یونہی چپہ چپہ چھان مارا ہوگا،" کیلی نے کہا۔

"ہائے۔ ہائے۔ اس نے عجیب حال کر لیا تھا وہاں۔ نہ دن دیکھا نہ رات،" قریب سے ماں نے بتایا اور پھر کہنے لگی "یہاں تو پھر تو موجود ہے اور پیار سے اُٹھ کر اُسے چائے کا گھونٹ بھی بنا دیتی ہے وہاں تو یہ صرف پانی پی کر ہی نکل کھڑا ہوتا تھا۔ وہاں تو لوگوں نے اس کا نام "بھگت جی" رکھ دیا تھا۔ کوئی اسے اچھا جانتا تھا اور کوئی بُرا۔۔۔"

"برا کیوں بھلا؟" کیلی نے چونک کر پوچھا۔

"کیا کہیں لوگ بھی سب بے چارے خود بھی تو دُکھی تھے۔ ایک دن تو اسے گلے سے پکڑ بیٹھے۔" ماں نے پھر نختے کی طرف دیکھا اور کہا "ارے۔ بہن کو وہ بات نہیں بتائی۔؟"

"اُس کا کیا بتانا۔" نختے نے منہ دوسری طرف پھیر کر کہا۔

"کیا ہوا تھا ماں تُو ہی بتا دے۔" کیلی نے کہا۔

"یہ کام بھی تو اُلٹے سیدھے کرتا تھا ویسے تو بھلا ہی کرتا تھا،" ماں نے ایک ہی سانس میں دونوں باتیں کہیں اور پھر بتایا "اُدھر مسلمانوں نے ظلم ڈھایا تھا اور ادھر بھی کچھ ہندو کر رہے تھے... اور اس خدا کے بندے کو تو تُو جانتی ہی ہے نہ ہندو۔ نہ مسلمان۔ اُدھر اُس نے ہندوؤں کی کئی لڑکیاں بچائی تھیں۔ تو اِدھر یہ مسلمانوں کی لڑکیاں بچانے لگا۔ بیچ بیچ میں لوگ کہنے لگے کہ یہ مسلمانوں سے ملا ہوا ہے۔ جبھی تو اُن کی بہو بیٹیوں کو بچاتا ہے۔"

"میں نے کسی کو کیا بچایا۔ میں تو ایک کو بھی..." بختا کا گلا بھر آیا۔

ماں بات نہ سمجھی اور کہنے لگی "لے۔ بچایا کیوں نہیں۔ ایک تو ہمارے سامنے کی بات ہے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا قافلہ جا رہا تھا۔ ہمارے ہی کیمپ میں سے لوگ جا کر رات کو تین عورتیں اُٹھا لائے۔ اسے سراغ

مل گیا۔ اس نے جا کر افسروں کے کان میں کچھ کہہ دیا اور پھر خود آدھی رات کو اُن عورتوں کے ساتھ جا کر انہیں دوبارہ قافلہ میں چھوڑ آیا۔"

"وہ تو"، بخشنے کی آواز اس کے حلق ہی میں اٹک گئی۔ اُس نے رُک رُک کر صرف اتنا کہا "کسی کی خاطر، ی۔۔۔۔"

کیلی کے دل میں اتنی کھُد بُد ہوئی کہ اس سے بخشنے کی طرف دیکھا نہ گیا اُس نے منہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔

"اری آج دیر کر دی ہے لڑکے نے۔ ابھی تک آیا ہی نہیں"، ماں نے بھی کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ اُس نے سمجھا کہ کیلی دیپک کے انتظار میں ہے اور باہر دیکھ رہی ہے۔

"ابھی آ جائیں گے"، کیلی نے باہر کی طرف ہی دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ماں کی طرف منہ پھیر کر بولی "تو تھک گئی ہو گی ماں بیٹھے بیٹھے۔۔۔۔"

"میں تو صرف تیرے لئے بیٹھی ہوئی ہوں۔ ورنہ مجھے تو اونگھ آ رہی ہے"

"اُٹھ پھر سو جا جا کر۔ میں بستر بچھائے دیتی ہوں۔"

"میں بستر تو کب کا بچھا چکی ہوں۔ بخشنے کا بھی بچھا آئی ہوں۔ اُٹھ بیٹا۔ تو تو سارا دن ٹانگیں توڑتا ہے۔"

"میں بھی آتا ہوں ماں۔ تم چلو۔"

ماں ساتھ کے کمرے میں سونے کے لئے چلی گئی بخشا وہیں بیٹھا رہا۔

"بخشے نے سوچا۔ ایک دو پل جو سونا ہے۔ یہ سوچ تو کبھی ختم نہیں ہوگی۔"

"آج کیلی مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"کیوں ۔۔؟"

"ایک خبر ملی ہے۔"

"کیا ۔۔؟"

"کہتے ہیں کل لائلپور کی طرف سے ایک ٹرک آرہا ہے۔"

"اور شاید۔"

"یہ سوچتا ہوں شاید۔ کہتے ہیں چکوں میں سے بہت عورتیں ملی ہیں۔"

کیلی کو وہ پرانا بھولا بسرا خواب یاد آیا جس میں اُس کے باپ نے اُس کے اور مترو کے سر پر پیار دے کر کہا تھا "رُوو نہیں۔ تمہیں ابھی بہت دُور جانا ہے۔ ہمت کرو۔"

کیلی نے کبھی یہ خواب بخشے کو نہیں سنایا تھا۔ آج اُس نے سارا خواب سُنایا اور کہنے لگی "یہ مترو کو کیا سفر درپیش آیا۔۔۔۔"

"کوئی بات نہیں کیلی۔ کاش اب بھی یہ سفر ختم ہو جائے۔"

"اسے تو جب گاؤں گیا تھا۔ دوبارہ تو کیا اُس سے وہاں ایک بار۔"

"کہاں کیلی۔ بس وہی تیرے ہوتے ملا تھا۔ وہ شاید آخری ملاقات تھی۔"

"تو جب گاؤں گیا تھا۔؟"

"سُنا تھا کہ اب وہ اچھی ہو گئی تھی اس لئے اس کے سسرال والے آکر اُسے لے گئے تھے۔"

"یہ دُنیا کے رشتہ دار کیسے ہوتے ہیں بخشے۔ بیمار ہو گئی تو پھینک گئے۔ اچھی ہو گئی تو لے گئے اور اگر کوئی اچھی بڑی ہو گئی تو بندھن بھی اس طرح اُتار کر پھینک دیا جیسے گلے سے کپڑا اُتار دیا ہو۔"

"میں نے اُس چالیسویں چک والے کو دیکھا تھا۔ اُسے تو وہ بھول کر بھی یاد نہیں آئی۔ وہ کچھ روپیہ پیسہ بچا لایا ہے۔ وہیں کیمپ میں ایک لڑکی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ شاید اب تک کر بھی چکا ہو۔ یا پھر زمین حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔"

"تو نے تو اپنے آپ کو خاک میں ملا دیا ہے بخشے۔"

"میں بادشاہ ہو جاؤں گا۔ کیلی اگر ایک بار...."

کیلی کی آنکھ کھل گئی۔ غسل خانہ سے بخشے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔

"جب دنیا میں کہیں آسرا نہ ملا۔
تو خدا کے در پر گر پڑے۔
گیہوں بھی بویا اور باجرہ بھی
آج قسمت آزما کر دیکھتے ہیں۔"

کیلی نے ہاتھ سے پاس پڑی ہوئی چارپائی ٹٹولی۔ دیپک ابھی تک گہری نیند سویا ہوا تھا۔ کیلی دھیرے سے اٹھی اور رسوئی میں جا کر چائے بنانے لگی۔

"کیلی مجھے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا ہی تھا مگر میرے ساتھ تو بھی۔"

بخشے نے رسوئی میں روشنی دیکھ کر اندر آتے ہوئے کیلی سے کہا۔ "نیند تو آج میرے نزدیک نہیں پھٹکی۔"

"کوئی بات نہیں بخشے۔ اب تو دن نکلنے ہی والا ہے۔"

بخشے نے چائے کا گلاس پکڑ لیا اور ایک گھونٹ بھر کر کہنے لگا۔ "آج تو میرے اندر چائے کا گھونٹ بھی نہیں جا رہا ہے۔"

"زبردستی ہی بھر لے ایک دو گھونٹ۔ کچھ تسلی ہو جائے گی۔"

بخشے نے چائے پی لی۔ لیکن آٹا گوندھتی ہوتی کیلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں کچھ نہیں کھاؤں گا کیلی۔"

"ارے پگلے۔ سارا دن کس طرح کاٹے گا۔"

کیلی کی بات ابھی اُس کے مُنہ ہی میں تھی کہ بخشے نے گلاس رکھ دیا اور پاگلوں کی طرح باہر کا دروازہ کھول کر چلا گیا۔

سارا دن کیلی کا دل ڈانواں ڈول رہا۔ بخشے کے صبح والے شعر کیلی کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"گیہوں بویا اور باجرہ بھی۔
آج قسمت آزما کر دیکھتے ہیں۔"

"اگر قسمت بھی آنسوؤں کے پانی سے پھول بن کر اُگ آیا کرے تو۔ ..."

کیلی سارا دن سوچتی رہی اور دروازے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر دوپہر ابھی ڈھلی ہی تھی کہ دروازے کے آگے ایک تانگہ آکھڑا ہوا۔

"کیا واقعی —؟" کیلی کے ہونٹوں میں سے نہیں اس کے سارے بدن سے یہ الفاظ نکلے۔

کیلی نے آگے بڑھ کر متر و کو تانگے میں سے اس طرح اُتارا جیسے کوئی دلہن کو ڈولی میں سے اُتارتا ہے۔ ماں دہلیز میں کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ یہ آنسو اس طرح تھے۔ جیسے کوئی ساس گھر آنے والی بہو کے سر پہ پانی وارا کرتی ہے۔

دیپک راتوں رات جالندھر گیا۔ بخشے نے جو پتہ ٹھکانا بتایا تھا وہاں جاکر
مترو کی ماں اور بھائی کو ساتھ لے آیا۔ ماں مترو سے یوں ملی جیسے وہ مترو کو
اپنے دامن میں نہیں اپنی کوکھ میں چھپا لینا چاہتی ہو۔

کیسلی کو ڈر تھا کہ نہ جانے مترو کی ماں کس انداز سے روئے گی۔ اُس
کا رونا تھم سکے گا یا نہیں پھر اُسے ڈر لگا کہ وہ بیٹی کی گلے سے لگے ہوئے
پُتّ کی بُت نہ بن جائے۔ چونکہ نہ اُس کے گلے سے کوئی آواز نکلی تھی۔
اور نہ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے۔

" موسی —— موسی۔" کیسلی نے رُک رُک کر اُس کے کندھے کو
جھنجھوڑا۔

" کافی دیر کے بعد اُس کے ہونٹ پھڑکے اور بڑی مشکل سے اُس
کے مُنہ سے صرف یہ آواز نکلی۔ بھاڑ میں جائیں۔ یہ لوگ۔" پھر ماں نے چونک
کر کمرے میں چار سو دیکھا۔ "کہاں ہے بخشا۔ مجھے آج اُس کے پاؤں دھو کر
پینے ہیں۔"

" بار بار بخت کا سر چومتی ہوئی ماں اپنا دُکھ بیان کرنے لگی۔" کوئی بات نہیں جو مجھے چھوڑتے ہیں۔ چھوڑ دیں۔ میں لوگوں کے برتن مانجھ لوں گی۔ لیکن میں اپنی بیٹی کو گلے سے لگائے رکھوں گی۔ مُوا۔ اِس کا تاؤ۔ پھر میں ٹانگ لٹکائے پڑا ہے۔ مگر بڑی بڑی آنکھیں نکال کر مجھ سے کہتا ہے۔" یہاں نہ لانا لڑکی کو۔ میں تو اُس کے سر پہ خاک بھی نہیں ڈالوں گا۔" اسے ہر جائیں وہ چالیسویں چک والے۔ چار پیسے بچا لائے ہیں۔ اس لئے تو۔۔۔ میری طرف سے ایک چھوڑ کر سات بیاہ کر لیں اپنے لڑکے کے۔۔۔۔ میرے دروازے کے آگے سے اُسے کیوں گزارتے ہیں۔ مجھے دکھا دکھا کر۔

دوسرے دن متّرد کی ماں کو جب ہوش آیا تو وہ کیلی کو ایک طرف لے جا کر اور پلّو سے کچھ روپے کھولتے ہوئے بولی " میں تیرا بدلہ نہیں دے سکتی بیٹی۔ ایک بار پہلے بھی جب مترو جاں بلب پڑی تھی۔ تو نے ہی اُسے اچھا کیا تھا۔ نہ جانے تو نے اُسے کیا منتر دیا تھا۔ کہ دنوں ہی میں وہ کچھ کی کچھ ہو گئی تھی، اب پھر اُسی طرح پڑی ہوئی ہے۔ پتھر کی پتھر۔ تو ہی اُس کا دل ٹھکانے لا سکتی ہے۔ یہ لے روپے۔ اُسے کپڑے سلا دے تھوڑے سے۔"

" یہ روپے تو اپنے پاس رکھ موسی۔ آج تُو میرے ساتھ بازار چلنا۔ ہم کپڑے لے آئیں گی جا کر۔ ہاں تو نے مجھے ایک منت دینی ہے۔ یاد ہے نا تجھے۔ آج وہ دے دے۔"

"مجھے یاد کیوں نہیں بیٹی؟"

"میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میں ابھی کچھ نہیں لوں گی۔ لیکن اگر متّرو اچھی ہو گئی۔ تو پھر میری اور تیری باتیں ہوں گی اور اب متّرو مر کر ملی ہے۔"

"وہاں تو میرا گھر بھرا ہوا تھا کیلی۔ تو جو منہ سے مانگتی۔ . . . یہاں میں کیا حاضر کروں تیرے لئے۔ میرے پاس تو صرف یہ ہاتھ پاؤں بچ رہے ہیں۔ ان سے میں ساری عمر تیرے پاؤں دباتی رہوں گی۔"

"مجھے شرمندہ نہ کر موسی۔ میں آج جو چیز مانگوں گی وہ تو مجھے انگلی کے اشارے سے دے سکتی ہے۔"

"اری۔ میں قربان جاؤں اگر میں تجھے کچھ دے سکوں۔"

"تو متّرو کا بیاہ بخشے سے کر دے۔ میری منت پوری ہو جائے گی۔"

متّرو کی ماں خاموش ہو گئی۔

"بس چُپ ہو گئی موسی۔"

"تو سمجھی نہیں کیلی۔"

"تو پھر مجھے سمجھا دے۔"

"بخشا بھی تو مرد ہے کیلی۔ تو مردوں کو نہیں جانتی۔"

"تیرا کیا خیال ہے؟"

"اب بخشا یہ بات نہیں ماننے گا۔"

" نہیں موسی۔ وہ تو شروع ہی سے مترو کو پیار کرتا تھا۔"

" یہ مجھے معلوم ہے کیلی۔ لیکن اُس وقت کی بات اور تھی۔"

" تو کیا اب اُس نے مترو کو ڈھونڈتے ہوئے یوں ہی اپنے آپ کو خاک میں ملا لیا۔؟"

" یہ تو خدا کی طرف سے ہی اُس کے دل میں کچھ ترس آگیا کیلی۔ اُس نے تو مسلمانوں کی لڑکیاں بھی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر دی تھیں۔"

" اچھا۔ تو اس کی بات چھوڑ دے موسی۔ تو اپنی بات کر۔"

" میں تو یہ سوچتی ہوں کہ اگر یہ بات ہو جائے تو میرے سارے دُکھ کٹ جائیں۔"

" چل۔ اُٹھ بازار چلیں۔ تو اپنے ہاتھوں سے چاہے ایک جوڑا ہی لاکر پہنا دے مترو کو۔"

" کیا تو سچ کہہ رہی ہے کیلی۔؟"

" بالکل سچ۔"

اور کیلی نے کمرے میں جاکر بلند آواز میں مترو سے کہا "اری اُٹھ مترو کوئی بُرادہ ورادہ جلا دے اُٹھا کر۔ کڑھائی رکھ دے چولے پر۔ میں اور موسی شگن کا جوڑا لانے جا رہی ہیں۔"

کیلی نے یہ بات اتنے زور سے کہی تھی کہ ساتھ کے کمرے میں کھڑے ہوئے

نکھٹو نے بھی سن لی۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اُس نے سچ مچ اپنی آری سے اور اپنے تیشے سے آج قسمت کی صورت بھی گھڑ لی تھی۔

متر و نے سر اُٹھا کر کیلی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو۔

"کیوں کیلی۔ یہ اسی جنم کی بات ہے نا۔؟"

ہماری مطبوعات

کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اوّل)	قرۃ العین حیدر	پاگل	خلیل جبران
" " " (حصہ دوم)	" " "	محبت اور جوانی	" "
آگ کا دریا	" " "	ایک گدھے کی سرگزشت	کرشن چندر
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	" " "	پھول کی تنہائی	" "
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	الٹا درخت	" "
پطرس کے خطوط	" "	محبت کی رات	" "
زیرِ لب	صفیہ اختر	مضامین کرشن چندر	" "
حرفِ آشنا	"	لذیذ پکوان	شائستہ کوثر
گنجے فرشتے	منٹو	نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر
انارکلی	"	کلیاتِ جگر	جگر مرادآبادی
ٹھنڈا گوشت	"	آتشِ گل	" "
کرنیں	شفیق الرحمٰن	کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ	تلخیاں	" "
تعمیرِ حیات	ڈیل کارنیگی	گلِ نغمہ	فراق گورکھپوری
زرد پتے	خلیل جبران		

مکتبہ اُردو ادبؔ لاہور